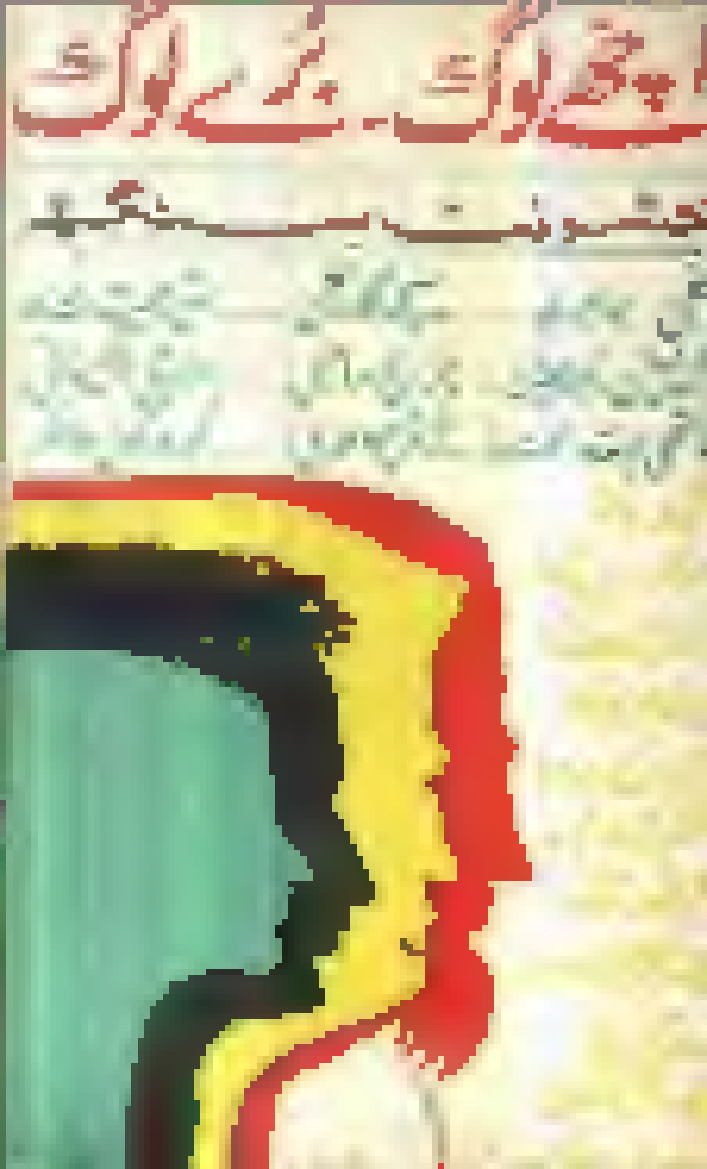

اچھّے لوگ ۔ بُرے لوگ

خشونت سنگھ

مکتبۂ شعر و اَدب ○ سمن آباد ○ لاہور ۔ ۲۵

ناشر..... نواز چوہدری
مطبع..... شکر گنج پرنٹرز لاہور
قیمت..... [redacted] روپے

سول ایجنٹ:
چودھری اکیڈمی ○ الفضل مارکیٹ۔ ۱۷۔ اردو بازار
لاہور

ترتیب

۱:۔ زُلفی ..... ہمارا ہمسایہ: ——— ۵
۲:۔ شکیلہ بانو..... سحر آفریں آواز: ——— ۱۵
۳:۔ ڈی۔ کے برووا..... مُسکراتا ہُوا بُدھ: ——— ۱۸
۴:۔ بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی: ——— ۲۳
۵:۔ نراڈ چودھری: ——— ۳۴
۶:۔ معجزہ ساز..... دادا جی: ——— ۴۲
۷:۔ موم بتی کی روشنی اور دا تائیل ——— ۴۵
۸:۔ مرارجی ڈیسائی: ——— ۴۹
۹:۔ سنجے گاندھی: ——— ۶۴
۱۰:۔ گورو گول والکر: ——— ۸۱
۱۱:۔ جے۔ پی..... ایک مکمل انقلابی: ——— ۸۹
۱۲:۔ جادو بھری آواز..... رُونا لیلےٰ: ——— ۹۹
۱۳:۔ ہیرلڈ سیکملن: ——— ۱۰۱

۱۴:۔ آندری مال راکس ... دھماکہ خیز قوت: ۱۰۴
۱۵:۔ کرشنا مینن ......اکیلا بیڑیا: ۱۱۵
۱۶:۔ فرینک مورلیس: ۱۲۱
۱۷:۔ گوروہ دیو۔ مکت آنند: ۱۲۴
۱۸:۔ منظور قادر......ایک بچھڑا ہوا دوست: ۱۳۰
۱۹:۔ ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشن......ایک تخلیق جوہر: ۱۳۵
۲۰:۔ رامن راگھاؤ......اسے پھانسی دو!: ۱۳۸
۲۱:۔ ستیہ جیت رے: ۱۴۶
۲۲:۔ بلراج ساہنی: ۱۵۰
۲۳:۔ بھگوان شری نیل کنٹھ مہاتما جی: ۱۵۲
۲۴:۔ ساسمی تبرت......عورت باز: ۱۵۵
۲۵:۔ بالا صاحب ٹھیکری......ایس۔ ایس۔ چیف: ۱۶۲
۲۶:۔ دانیال وال کاٹ......فضائی سمگلر: ۱۶۷

زُلفی — ہمارا ہمسایہ

۱۹۷۶ء میں محمد علی جناح کے سو سالہ جشن ولادت پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے میں بھی مدعو تھا۔ مجھے بھٹو صاحب سے متعارف کرایا گیا ان کی دوستی میں گرم جوشی تھی۔ میں نے ان سے انٹرویو کی درخواست کی۔ انہوں نے چند روز بعد دن کا کچھ حصہ میرے ساتھ گذارنے کا وعدہ کیا۔ اور آئندہ روز ہی میری ان کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو بیک وقت تین شخصیتوں کا مالک ہے جاگیردارانہ مزاج کا حامل سندھی زمین دار، آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ یورپیوں کی طرح خوش اخلاق اور خوش اطوار اور سیاستدانوں کی سی مکاری کا حامل سیاستدان وہ موقع کے مطابق اپنی شخصیت کے سحر کو بروئے کار لاتا ہے۔

وزیر اعظم بھٹو کی راولپنڈی والی رہائش گاہ کسی خاص طرز تعمیر سے عاری اور ایک منزلہ ہے۔ البتہ اس کے اردگرد پنجابی اور پٹھان دراز قد فوجی سپاہیوں کا حفاظتی پہرہ لیکن یہ پہرہ بھی حقیقت سے زیادہ نمائشی معلوم ہوتا ہے پاکستان میں رہنے والے کسی بھی شخص کو ذوالفقار علی بھٹو کی غیر معمولی ہر دل عزیزی بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ پاکستان کی ایک "شخصی جمہوریت" کا بانی اور محافظ ہے۔

اے ڈی سی مجھے اس کمرے میں لے جاتا ہے جہاں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی ضخیم جلدیں کمال احتیاط کے ساتھ قطار اندر قطار رکھی ہیں۔ دیوار پہ استاد اللہ بخش کے سٹائل پر مبنی پنجابی مٹیاروں کی ایک بہت بڑی آئل پینٹنگ آویزاں ہے قریب ہی نرگس کے پھولوں سے بھرا ایک گملا ہے جس سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ بھٹو صاحب عین اس لمحے اندر آتے ہیں جو ملاقات کیلئے

محسوس کرتا ہوں کہ وہ جلدی میں ہیں اور خوش گپیوں کا وقت نہیں۔ میں فوراً ان سوالوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میں نے نوٹ کر رکھے ہیں

س :۔ شملہ سمجھوتے پر عمل درآمد کے لیے آپ کے ذہن میں کون سے ٹھوس اقدام ہیں؟

ج :۔ شملہ سمجھوتے پر دونوں جانب سے عمل ہو رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی نے شملہ سمجھوتے میں شامل مسائل میں سے ایک بڑے مسئلے کے علاوہ سب کا حل تلاش کر لیا ہے۔ تجارت بحال کی جا چکی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔ فضائی سفر بحال کیا جا چکا ہے اور دونوں ملکوں کے عوام اس سفر سے مستفید ہو رہے ہیں۔ حالات معمول پر لانے کا عمل جاری ہے۔

(میں حالات کے معمول پر لانے کے بارے میں کچھ اور دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ بعد میں پوچھوں گا)

س :۔ لیکن ابھی تجارت اور عوام کی آمد و رفت میں بہت کچھ کیا جانے والا ہے

ج :۔ تجارتی روابط بحال ہونے میں کچھ دیر تو لگے گی ہی۔ گذشتہ دس گیارہ سال سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت نہیں ہوئی۔ اب تجارت پیشہ لوگوں اور صنعت کاروں کے درمیان پرانے روابط بحال ہو رہے ہیں یا نئے رشتے استوار ہو رہے ہیں۔ اب نئے معاہدے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح باہمی مفاد کی خاطر تجارت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

س :۔ کیا بھارت سے اشیاء خریدنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی گئی۔

ج :۔ عام طور پر تو ایسی کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیئے۔ جو چیز معیاری ہوگی اور ہمیں دوسرے ملکوں کی نسبت بھارت سے ارزاں نرخ پر ملے گی تو ہم کیوں نہ خریدیں گے لیکن ہم ایسی تجارتی پالیسی وضع نہیں کرنا چاہتے جس کی بنا پر ہماری تجارت کا دارومدار صرف ایک ہی ملک تک محدود ہو کر رہ جائے اور نہ ہی ہم ان ملکوں کے ساتھ تجارتی روابط ختم کر سکتے ہیں جن کے ساتھ ہم ایک عرصے سے تجارت کر رہے ہیں۔ ان تجارتی روابط نے ہماری تجارت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ہم تجارت کا موجودہ ڈھانچہ تبدیل

نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن پھر بھی اصل اہمیت قیمتوں کی اور اشیاء کی کوالٹی کی ہے۔ لیکن بھارت کے ساتھ تجارت میں کوئی رکاوٹ یا پابندی ہرگز نہیں۔

س :۔ کیا ایسا خطرہ لاحق ہے کہ کسی ایک شے کی تجارت میں پاکستان، بھارت کا دستِ نگر ہو کر رہ جائے گا۔

ج :۔ اب ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ کسی ملک کا ایسے سلسلے میں دست نگر ہو جانا حقیقت کی بجائے زیادہ خوف پر مبنی ہی ہوتا ہے اگر کسی ملک کو کوئی خاص چیز مہیا نہ ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس ملک کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ء میں ہماری فوجی رسد بالکل ختم ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں ہمارے ملک پر پابندی بھی لگ چکی تھی۔ اس وقت ہمیں صرف امریکہ سے فوجی ساز و سامان ملتا تھا لیکن ہم نے نئے ذرائع تلاش کئے اور ہمیں دوسرے ملکوں سے بھی فوجی سامان موصول ہوا۔ البتہ وقت کی دشواری کا مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن ذرائع رسل و رسائل کے اس تیز رفتار دور میں اس کی بھی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ نئے سامان سے واقفیت پیدا کرنا اور اس کی تربیت حاصل کرنا بھی ایک مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن اس پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے ہم ایک ہی ملک تک محدود ہونے کا تجربہ کر چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ صرف ایک ہی ذریعے کے بار آور نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے اس لیے اگر ہمارے تجارتی شعبے کا ایک حصہ بھارت سے لوہے، سٹیل، ٹریکٹر یا کسی بھی شے کی تجارت کرتا ہے تو ہمیں محدود ہونے کا اندیشہ نہیں ہوگا کیونکہ آخر کار بھارت بھی تو ہم سے کچھ نہ کچھ خریدے ہی گا اگر باہمی تجارت میں ایسے حالات پیش آئے بھی تو ہم اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ان سے نمٹ لیں گے اس سلسلے میں ہمیں خاصی مہارت حاصل ہے۔

(اب میں ایک خار دار سوال کی طرف آتا ہوں)

س :۔ جب آپ کہتے ہیں کہ صرف ایک بڑا مسئلہ باقی رہ گیا ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ کشمیر کی بات کرتے ہیں؟

ج :۔ ہاں یہ بات درست ہے جموں کشمیر کا مسئلہ ہی وہ واحد مسئلہ ہے جو شملہ سمجھوتے

کے مسائل میں سے باقی رہ گیا ہے اس سمجھوتے کی رو سے مسئلہ کشمیر پر دونوں حکومتوں کے درمیان ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کسی بہتر ماحول میں گفتگو کرنا طے پایا ہے یہ سوال بہت سے دیگر صحافیوں اور اخبار نویسوں نے بھی مجھ سے پوچھا ہے۔ دونوں ملک اس مسئلے پر مناسب وقت پر باہمی مذاکرات کریں گے۔

اس کے علاوہ سلال ڈیم کا مسئلہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کا مناسب حل بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ درحقیقت سلال ڈیم بھی مسئلہ کشمیر ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس ڈیم کا مسئلہ "معاہدہ سندھ طاس" کے تحت بھی آتا ہے اس لئے عام طور پر یہ مسئلہ شملہ سمجھوتے کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں ہمیشہ ہی کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے انتخابات کے بعد ہی دونوں ملک اس مسئلے پر سوچ بچار کریں گے لیکن یہ اس وقت تک کی بات ہے جب آپ کی حکومت نے انتخابات ایک سال تک ملتوی کر دیئے اس کے بعد میں نے یہ بیان نہیں دوہرایا۔ ہم ۱۹۷۷ء میں انتخاب کروائیں گے اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت مذاکرات میں بہتر طور پر شامل ہو گی میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہماری پارٹی کی حکومت بنی تو ہم آپ کی حکومت سے باہمی مذاکرات کریں گے اور اس کا مطلب شملے سمجھوتے پر صحیح معنوں میں عملدرآمد ہو گا۔

س:۔ کیا آپ کے ذہن میں کشمیر کے بارے میں کوئی نئی تجاویز ہیں؟

ج:۔ نہیں نئی تجاویز کی کیا ضرورت ہے۔ شملہ سمجھوتے میں اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن جب مذاکرات کا آغاز ہو گا تو پھر ہم یہ دیکھیں گے دوسرا فریق اس بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور پہلے سے طے شدہ امور پر کتنا عمل کرتا ہے۔ اگر بھارت کا خیال ہو کہ اس مسئلے کے لیے یہ بنیاد مضبوط نہیں تو پھر بھارت ہی کو بتانا ہو گا کہ مذاکرات کن بنیادوں پر ہوں گے۔ پاکستان کی اصولی بنیاد وہی ہے جو ہم ایک عرصے سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں کہتے آئے ہیں۔ اگر بھارت اس طے شدہ امر کو نہیں مانتا تو پھر اسے ہی بتانا ہو گا کہ وہ اس بارے میں کیا کرنا چاہتا ہے ہمارے پاس تو اس کے علاوہ کوئی بنیاد نہیں۔ ہم صرف مسئلے کے جمہوری حل پر یقین رکھتے ہیں یعنی

عوام کی رائے کے مطابق آپ میرے تمام فیصلوں کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں نے کبھی کوئی فیصلہ جمہور کی آواز کے خلاف نہیں کیا۔

س:۔ کیا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ مفید ہو گا۔؟

ج:۔ یہ مسئلہ بھی شملہ سمجھوتے میں زیر غور آیا تھا اور ہم نے یہ محسوس کیا تھا کہ عدم جنگ کا معاہدہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو چکے ہوں۔ تمام مسائل طے ہونے کے بعد بھی جنگ ہو سکتی ہے لیکن اگر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا ہو تو پھر پہلے تمام چھوٹے بڑے مسائل حل ہونے چاہئیں مثال کے طور پر سندھ طاس معاہدے کے مسائل وغیرہ۔ بالفاظِ دیگر اگر دو طرفہ مذاکرات ناکام ہو جاتے ہیں تو ہم اپنی جگہ واپس آ سکتے ہیں، کوئی درمیانی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کسی کو ثالث مقرر کر سکتے ہیں یا پھر بین الاقوامی عدالتِ انصاف سے رجوع کر سکتے ہیں۔ صرف اور صرف بین الاقوامی قانون کے تحت ہم خود اختیارانہ طور پر مسائل کا حل تلاش کر لیں تو پھر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو پھر ایسے معاہدے میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہو گا کہ دونوں حکومتوں نے مسئلہ کشمیر کو التواء میں ڈال دیا ہے۔

س:۔ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ آپ کی ذہنی ہم آہنگی کس سطح پر ہے۔؟

ج:۔ میں نے آپ کو گذشتہ رات بھی بتایا تھا کہ مسز گاندھی نے شملے سمجھوتے میں بہت کارآمد اور ٹھوس قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے جرأت اور عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس معاہدے میں مخلص نظر آتی ہیں اور ہمارے ملک کے ساتھ نارمل اور دوستانہ تعلقات کی خواہش مند ہیں۔ گذشتہ پانچ سالوں کے دوران میں تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں بار آور ثابت ہوئی ہیں اور یہ صرف اسی صورت میں ہوا ہے۔ کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں معمول کے تعلقات میں مخلص ہیں۔ اس سے آپ خود مسز گاندھی کے ہندو پاک تعلقات کے بارے میں نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

س:۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے انہیں پاکستان کے دورے کی دعوت دی ہے؟

ج :۔ جی ہاں ۔ بالکل ۔ شملہ سمجھوتے کے دوران ہی میں نے انہیں اپنے ملک آنے کی دعوت دی تھی اور اس کے بعد بھی میں اس دعوت کا اعادہ کرتا رہا ہوں ۔

س :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یورپی مشترکہ منڈی کی طرح بنگلہ دیش ، پاکستان اور بھارت کی بھی کوئی ایسوسی ایشن بن سکتی ہے ۔ ؟

ج :۔ فی الحال تو میں ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کی طرح ان تین ملکوں کے درمیان اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کیونکہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی صورت حال ایسی ہے جیسی کہ یورپی ملکوں کے درمیان معاہدے کے وقت تھی اگرچہ یورپی ملکوں کے درمیان کوئی شدید اختلافات نہیں تھے پھر بھی انہیں اس معاہدے پر پہنچنے کے لیے خاصی دیر لگی ۔ یورپی ملکوں میں سیاسی شعور پختہ ہو چکا ہے ۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ وہ حکومتیں خاصی پرانی ہیں یا ان کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے ۔ بلکہ ان کے درمیان چھوٹے بڑے مسائل سلجھانے کی قوت اور استعداد بھی ہے ان ملکوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ صرف ایک ہی نشست میں طے نہیں پایا تھا ۔ یورپی ملکوں کے درمیان پاکستان ، بھارت اور بنگلہ دیش جیسے معروضی حالات نہیں ۔ ابھی ہمارے تعلقات پختہ نہیں ہوئے ۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان وہ تعلقات نہیں جو آج سے دو سال پہلے تھے ۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بھارت ، بنگلہ دیش سے اپنے شکستہ تعلقات بحال کرنے کی کوشش میں ہے ۔ فرخا بیراج کے بارے میں وزارتی سطح پر جو مذاکرات ہو رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ملک اپنے کشیدہ تعلقات کی بہتری کی خاطر معروفِ عمل ہیں لہٰذا اولین ضرورت تو یہ ہے کہ بھارت اور بنگلہ دیش کے باہمی تعلقات بہتر صورت اختیار کر جائیں ۔ اسی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں ابھی پختگی کی کسر ہے اسی طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بہت کچھ کرنا باقی ہے جب ہم تینوں ممالک اپنی اپنی سطح پر ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تب ہی کسی بڑے سمجھوتے یا ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے ۔

س :۔ پاکستان نے چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ کیا پاکستان ہمارے درمیان ایسا نہیں کر سکتا ؟

ج :۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان

س :۔ نہیں بھارت اور چین کے درمیان ۔ ؟

ج :۔ خوب ! بھارت اور چین نے سفارتی سطح پر کچھ تبدیلیاں نہیں ہیں اور یہ بہت سی نمایاں تبدیلی ہے اور میرے خیال میں آپ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی صورت نظر آ رہی ہے ۔ لیکن چین ایک بڑی طاقت ہے اور ہمیں بڑی طاقتوں کی سیاست کا خیال بھی رکھنا ہے ۔ بھارت اور چین کے تعلقات کی بہتری ، پاکستان کے کسی اقدام پر منحصر نہیں ہے کسی بھی چھوٹے ملک کے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ تعلقات کا انحصار کلی طور پر مختلف عناصر پر ہے ۔

س :۔ میں آپ کے کچھ اندرونی ملکی مسائل کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں آپ نئی روشنی کے فرد ہیں ۔ آپ اپنے ملک میں ترقی پسندانہ قوانین لانے کے لیے مقامی علماء کے رویے کے بارے میں کیا کہیں گے ۔ ؟

ج :۔ مجھے ان سے کسی خطرے کی توقع نہیں ۔ ماضی میں علماء نے حکومتوں کو کافی پریشان کیا ۔ بعض تو علماء کے حق میں تھیں ۔ بعض بالا قتدار یا پارٹی کی سطح پر ان سے بیزار تھیں ۔ میرا ان کے ساتھ بالکل مناسب رویہ ہے ۔ ایک ترقی پسند مسلمان کی حیثیت سے میں ان کے سامنے ہوں مجھے اعتراف ہے کہ اس معاشرے میں ان کی ایک حیثیت ہے ۔ لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سماجی سدھار میں ان کی حیثیت کوئی بنیاد مہیا کرنی ہے ۔ اسی لیے میں پاکستانی معاشرے کو جدید بنانے کے لئے اپنی اصلاحات نافذ کر رہا ہوں ۔ نہ ہی میں ان کے ساتھ کسی قسم کا تصادم چاہتا ہوں ۔ میں اپنی اصلاحات کی وضاحت ان کے سامنے اسی انداز میں پیش کرتا ہوں جو انداز وہ سمجھتے ہیں ۔ اس سے فائدہ ہوا ہے ۔ میری پارٹی !!؟

س :۔ کیا آپ نے قانونِ شریعت میں بھی کوئی اہم اصلاحات کی ہیں ؟

ج :۔ بالکل نہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی عائلی قوانین جو کہ قانونِ شریعت پر مبنی ہیں ہمارے ملک میں نافذ ہیں۔ صرف سرداری قوانین اور قبائلی قوانین کو ختم کر کے قانونِ شریعت نافذ کیا گیا ہے۔ یہ ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ بلوچستان اور سرحد کے کچھ علاقے ہیں سرداروں کے بنائے ہوئے جاگیردارانہ قوانین کو ختم کر کے وہاں قانونِ شریعت کی بالادستی قائم کی گئی ہے۔

س :۔ تعددِ ازدواج اور طلاق کے قوانین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ خواتین آج بھی ان قوانین کا جبر برداشت کر رہی ہیں۔

ج :۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔ تاہم عورتوں کی آزادی کی خاطر تعددِ ازدواج اور پردہ اور طلاق کے بارے سوچ رہے ہیں۔ ہم نے خواتین کے لیے زیادہ ملازمتیں مہیا کی ہیں بلکہ حکومتی سطح پر اہم ملازمتیں۔ اب وہ ملک کے تقریباً ہر شعبے میں موجود ہیں۔ اس طریقے سے ہم ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معاشرے میں باعزت مقام مہیا کرنے میں ان کی مدد کر رہے ہیں

س :۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج :۔ ہمارے ہاں اسقاطِ حمل کو قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے اور ہم اسے قانونی تحفظ دیں گے بھی نہیں۔ ہم نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں زبانی بات چیت کی بجائے عملی اقدام کیے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو اس کی تعلیم دی ہے ہم نے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں لوگوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے ہے۔ اب وہ عام طور پر مانع حمل ادویات استعمال کرتے میں ہرج نہیں سمجھتے۔ ان خطوط پر عمل پیرا ہو کر ہم بہتر نتائج حاصل کر رہے ہیں ایسے نتائج جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ فائدہ مند ہوں گے۔ لیکن ہم کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتے کیونکہ اس سے بعض اوقات برعکس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

س :۔ پاکستان میں نس بندی کا کوئی پروگرام نہیں ؟

ج :۔ نہیں صرف رضاکارانہ طور پر نس بندی کا انتظام ہے۔ وہ قطعاً رضاکارانہ۔

س :۔ پاکستان میں اقلیتوں کا کیا حال ہے۔ غالباً ان کی تعداد آبادی کا ۵ فیصد ہے۔

ج :۔ جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے میں آپ کو بلاخوفِ تردید بتا سکتا ہوں کہ ہم ان کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں مقننہ اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی ہے۔ ان کے معاملات کے لیے ایک الگ وزارت موجود ہے اور حال ہی میں ان کے حوالے سے ایک ہفتہ بھی منایا گیا ہے۔

ملازمتوں کے حصول یا میڈیکل یا پیشہ ورانہ تدریس کے کالجوں میں داخلے کے لیے اقلیتوں پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ حکومت میں شریک ہیں اور ہمارے بعض اقلیتی برادر تو بیرونی ملکوں میں سفیر بھی ہیں۔ اسی طرح میری حکومت نے ان کا اعتماد زیادہ بلند کیا ہے اور انہیں احساس دیا ہے کہ وہ بھی مساوی شہری حقوق کے حامل ہیں۔

س :۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی ریاست ہے اس لیے کیا وہ اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھتے۔

ج :۔ ہرگز نہیں۔ ایسا سمجھنے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں۔

س :۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی سربراہِ ملک بننے کی خواہش نہیں کر سکتا۔

ج :۔ یہ صرف پاکستان میں ہی نہیں۔ برطانیہ میں صرف ایک پروٹسٹنٹ ہی شہنشاہ ہو سکتا ہے اور دوسرے ممالک میں بھی ایسی پابندیاں ہیں۔ بات اصولی اور عملی سطح کی ہے۔ ملک کی پچاسی سے نوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے لہٰذا وہ جب بھی کسی کا انتخاب کریں گے تو وہ ان ہی میں سے ایک ہوگا۔

س :۔ کیا آپ قائداعظم کے صد سالہ جشنِ ولادت پر کوئی پیغام دیں گے۔

ج :۔ میں اس سلسلے میں پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس وقت ہم اس جشن کی تقریبات کے آخری ہفتے میں ہیں۔ آپ چونکہ ایک بھارتی شہری ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ قائداعظم نہ ہندوؤں کے خلاف تھے۔ نہ بھارت کے۔ پہلے پہل۔ اپنے کیریئر کے آغاز میں قائداعظم کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اخوت کا سفیر کہا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں جب ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے

تو انہوں نے پاکستان کا نعرہ لگایا۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان کی تخلیق کے بعد بھی قائداعظم بہتر ہندو پاک تعلقات کے خواہاں تھے۔

اس وقت ہم تعلقات کو معمول پر لانے کی بات کر رہے ہیں۔ قائداعظم نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بات کی تھی۔ اور وہ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے زبردست خواہش مند تھے۔ بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات ان کی نظر میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ اگر پاکستان کی پیدائش کے سال بھر بعد اُن کا انتقال نہ ہو جاتا تو یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آتی۔ قانون ساز اسمبلی میں اُن کی تقاریر سیکولر رجحان کی حامل تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو پاکستان میں رہنے اور ہجرت نہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ جب ۱۹۴۸ء میں کراچی میں فسادات برپا ہوئے تو قائداعظم بہت فکرمند ہوئے۔ قائداعظم کی اس سوچ کو زیادہ عام نہیں کیا گیا لیکن وہ موجود تو ہے۔ اگرچہ وہ پاکستان کے خالق اور بانی تھے تاہم انہوں نے بھارت یا بھارت کی قومی برتری کے بارے میں کبھی بغض کا اظہار نہ کیا۔ وہ تو بھارت اور پاکستان کو سویڈن اور ناروے کی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ دو الگ الگ ملک لیکن خود اختیار، مسادی اور دوستی کے رشتے میں جڑے ہوئے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تو بمبئی میں اپنا گھر محفوظ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اگر کبھی وہاں جائیں تو دو چار ماہ گذار سکیں۔ یہ ان کی اولین سوچ تھی مگر بدقسمتی سے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو گئے اور تعلقات بدتر ہوتے گئے۔

ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے قائداعظم کی اس قسم کی تقاریر اور بیان پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ حیدرآباد، جوناگڑھ اور کشمیر میں ہونے والے واقعات کے باوجود قائداعظم باہمی خوش گوار تعلقات پر مصر تھے۔ یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید یہ مسائل پیش ہی نہ آئے۔ لیکن ان کی موجودگی میں ایسا ہوتا بھی تو وہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے تمام مسائل حل کر لیتے۔ یہ تھا قائداعظم کا نقطہ نظر۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض اوقات تاریخ کے کچھ اوراق گم ہو جاتے ہیں اور ہم بہت سی اہم واقعات اور عوامل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

شکیلہ بانو ــ سحر آفریں آواز

شکیلہ بانو ــ ایک نابغہ روزگار ــ اس ملک میں کسی مرد، عورت، سیاسی لیڈر شاعر، فلم ایکٹر یا مذہبی رہنما نے لوگوں کے دلوں پر حکومت نہیں کی سوائے شکیلہ بانو کے جس کی آواز میں وہ جادو ہے جو کئی گھنٹوں تک لوگوں کو حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ایک درشت آواز جیسی ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں سانس کی تکلیف ہو، ایک قبول صورت چہرہ لیکن میک آپ زدہ اور موٹاپے کی جانب مائل جسم،

اس کا لباس بھی اس کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ سفید زمین کو چھوتا ہوا لباس اوپر سے سبز، زرد پھولوں سے ڈھکا ہوا سونے اور چاندی کے رنگوں کی لیس سے مرصع جس پر گول ٹکے چمک رہے ہیں۔ زیورات سے لدی پھندی ــ عروسی ٹیکہ کان میں بالیاں، ناک میں نتھ، نیکلیس بازوؤں میں سنہری بازو بند، مارلن میزو کی طرح کی جنسی نغاست۔

شکیلہ بانو وقت کی پابند نہیں اور اس وجہ سے بہت بدنام ہے۔ لوگ انتظار کرتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، بلبوں اور کتوں کی آوازیں نکالتے ہیں لیکن پنڈال چھوڑ کر جاتے نہیں ــ "ایک گھنٹہ انتظار کیا مطلب ــ"؟ اس کے کسی سازندے سے پوچھ لیجئے ــ "وہ تو ولایت میں بھی دیر سے پہنچتی تھی ــ"

شکیلہ بانو کسی مغل ملکہ کی طرح نمودار ہوئی ہے۔ حسد متکاروں کا ایک گروہ اس کے گرد ہوتا ہے۔ پاندان بردار، آبدار، پنکھا کرنے والا اور بہت سے دوسرے ایسی ملکہ سے لیٹ آنے پر کون جواب پرسی کر سکتا ہے۔ لوگ تو بس اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے اور وہ بغیر کسی ہنگامے کے شروع ہو جاتی ہے

وہ اپنے سامعین کے دلوں پر جادو تک دیتی ہے مائیکروفون پہ گلا صاف کرتی ہے۔ اُسے تنگ کرنے کے لیے ہزاروں لوگ گلے صاف کرتے ہیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں ہر ایک چہرے پر مرکوز کرتی ہے اس مصنوعی ناراضگی سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے اور مجمع قہقہوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ آرکسٹرا کو خاموشی کا حکم دیتی ہے اور مائیکروفون پر گہرا سانس لیتی ہے۔ ہال کے تمام کونوں سے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ انہوں نے اس کا ہر نغمہ سن رکھا ہے تاہم وہ اسے بار بار سننا چاہتے ہیں۔ وہ احتجاج کرتی ہے اور پھر وہ آخری لفظ ادا کرتی ہے۔ اس کا آخری لفظ ہوتا ہے۔ "ہاں"۔ وہ اپنے چوٹی کے نغمے سے شروع کرتی ہے "بہار آئے"۔ لوگوں نے سینکڑوں دفعہ یہ نغمہ سنا ہے۔ شکیلا اسے ہر مرتبہ نئے شعروں اور دھنوں کے ساتھ تازہ کرتی ہے۔ وہ تمام سامعین کو اپنی آواز کے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ وہ دیر سے آنے والے کے لیے رکتی ہے۔ اسے سرزنش کرتی ہے اور پھر فوراً کہتی ہے "حضور ہم نے آپ کا خاصا انتظار کیا۔ اب ہمارا دل مطمئن ہے"۔ وہ دل سے فلرٹ کرتی ہے لیکن عورتوں کو بھی نہیں بخشتی "بہن۔ یہ ہمارے لیے ہے۔ میرے اور تمہارے لیے"۔ وہ نغمے کے کسی بول کی طرف متوجہ کر کے کہتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سننے والوں میں سے بہت سے اس کی اردو اور فارسی نہیں جانتے۔ پھر وہ آسان ہندی میں ترجمہ کر ڈالتی ہے۔ اور پھر بالکنی میں کسی اونچی کرسی پہ بیٹھے سردار کی طرف فقرہ پھینکتی ہے "سردار جی۔ یہ آپ کے لیے"۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ سردار اس کا کوئی گہرا دوست ہے لیکن شکیلہ کے لیے سب برابر ہیں۔ ہر کوئی ہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی زیادہ دوست ہے۔

مون سون کا گیت شروع ہوتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ ڈھول پیٹا جاتا ہے اس کی ماں جمیلہ بانو آہستہ آواز میں شامل ہوتی ہے۔ عبدالوحید خاں اپنی بلند آواز سے ساتھ دیتا ہے۔ شکیلہ اسے گھورتی ہے۔ وہ آہستہ کر دیتا ہے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ ان قہقہوں پر وہ پھر فقرے پھینکتی ہے۔ اس کا بھائی ادریس محمد خاں جو ہر قسم

کا ساز بجا لیتا ہے اپنے موٹے پیٹ سے گڑگڑاتا ہوا ہنستا ہے اور ساری محفل اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

شکیلہ کسی ملکہ عالیہ کی مانند اپنا ہاتھ روک لیتی ہے۔ خاموشی۔ "جگنو"۔ کوئی بالکنی سے چیختا ہے۔ وہ جگنوؤں کے بارے میں ایک آدھ شعر سناتی ہے۔ جگنو اور مچھر۔ لوگ بیک آواز چلاتے ہیں۔ شکیلہ بانو لطیفہ سناتی ہے "ایک آدمی مچھروں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چادر میں چھپا لیتا ہے۔ مچھر مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رضائی سے سر نکالتا ہے تو ایک جگنو کو اوپر اڑتے ہوئے دیکھتا ہے غصے سے کہتا ہے "چالاک مچھر۔ تم اندھیرے میں مجھے تلاش کرنے کے لیے دیا لے کر آ گئے ہو"۔ قہقہے ایک بار پھر بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی دلآویز حرکت سے لوگوں کو خاموش کراتی ہے اور مون سون کا نغمہ سننے کے لیے کہتی ہے۔ یہ شکیلہ بانو ہے۔ جمیلہ بانو کے پانچ بچوں میں سب سے بڑی۔ اس نے یہ فن اپنی ماں سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اس کی آواز کا کرشمہ صرف دیوتاؤں کی دین ہے۔ شکیلہ سے بہتر قوالی گانے والے موجود ہیں لیکن کسی کو اتنی خوش بختی حاصل نہیں کہ شکیلہ کی طرح سننے والوں کے دریا موجود ہوں۔

جب نوابوں، بیگمات اور وزرائے اعلیٰ کے نام لوگوں کی یادداشت سے نکل جائیں گے تب لوگ بھوپال کو صرف ایک ہستی کے نام سے یاد رکھیں گے اور وہ ہے بھوپال کی بیٹی شکیلہ بانو ——

ڈی۔ کے۔ بروہا۔ مسکراتا ہوا بدھ

آپ نے چین کا مسکراتا ہوا بدھ تو دیکھا ہوگا۔ وہی زرد رنگت، نیم بند آنکھوں والا۔ منگولی نقوش، پھولا ہوا پیٹ اور ہنسی کا گول گپا۔ یہ ہیں ہمارے ڈی۔ کے۔ بروہا۔ ایک باتونی آدمی ___ ہر وقت باتیں کرنے والے اور ہر وقت کھانے والا۔ مونگ پھلی کھانے کے دوران وہ لطیفے پر لطیفہ سنائے جاتا ہے جو بہت سے اس کے خلاف ہی ہوتے ہیں۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ تاریخ، ادبیات، آرٹ، فن تعمیر، مذہب اور سیاست اس کی گفتگو کے موضوعات ہیں۔ سیاست پر بہت کم گفتگو کرتا ہے بعض اوقات تو مجبوراً سیاست کو چھیڑتا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا سوال پوچھنا چاہیں جو اسے پسند نہ ہو تو وہ آپ کی سنی ان سنی کر دینے کا فن جانتا ہے ایک سیاسی کارکن میں شاید ہی یہ عجیب و غریب عادتیں موجود ہوں جب اس سے ہمارا تعارف ہوا تو وہ آسامی شاعری پر بحث کر رہا تھا۔ ویسے ٹی ایس ایلیٹ، ٹیگور، روسیٹی اور ٹینی سن اس کے پسندیدہ شاعروں میں ہیں۔ وہ سوئن برن اور براؤننگ کی شاعری پسند کرتا ہے حیرانی کی بات ہے کہ اس نے سولہ سال کی عمر میں نظم کہنی شروع کی اور پھر ۲۰ سال کی عمر میں اپنا قلم رکھ دیا کبھی نہ اٹھانے کے لیے۔ اس کے خاص موضوعات کیا تھے؟ دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح موت اور وقت۔ ہاں محبت بھی۔ انسانی حقیقت اور فلسفیانہ معروضیت۔ اس کی بہترین نظم وہ قرار پائی جس میں انسانی ارادے اور تقدیر کا اختلاف پایا جاتا ہے خدا اور بندے کے درمیان قدیم جھگڑا۔ یہ نظم لکھنے میں آدھ گھنٹہ اور مونگ پھلی کے دو بڑے پیالے صرف ہوئے۔ دوسرے لوگ بھی اس سے متعارف ہونا چاہتے تھے لیکن وہ ادھر ادھر کونوں کھدروں میں سرگوشیاں

کرتا پھر رہا تھا۔ ہمارے سیاستدان تاریک کونوں میں سرگوشیاں کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن وہ جلد ہی واپس آ گیا اور میرے گھٹنوں پر دوستانہ طور پر ہاتھ جماتے ہوئے بولا ___ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا ___"

اور اب وہ ذات پات پر بحث کر رہا تھا۔ کہ سکھوں کی کوئی ذات نہیں، کھتری بھی تھے، تجارت پیشہ بھی، جنگجو، شاعر، فلاسفر اور نہ جانے کیا کچھ۔ کیا سکھوں کے دس کے دس گرو کھتری نہیں تھے۔؟ اور رنجیت سنگھ کے بہترین جرنیل۔ حکم چند، دیوان چند اور ہری سنگھ نلوہ۔ کچھ اور مونگ پھلیاں اور اخروٹ صرف ہو گئے اور مجھے انٹرویو کے لیے دیا گیا بہت سا وقت بھی ___ اب پھر وہ ایک مقامی سیاسی لیڈر سے ملنے کے بعد میری طرف آیا اور کہنے لگا۔ اور ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔۔
میں نے اس اڑنے بھینسے کو سینگ سے پکڑنے کی کوشش۔

س: آپ کی پارٹی کا تاثر بہت غلط ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کر رہے ہیں؟ اس نے میرے اس حملے سے اپنے آپ کو دلیری سے بچایا۔ بلند آواز سے قہقہہ لگایا اور بولا

ج: یہ ایک نہایت اعلیٰ سیاسی غلط فہمی ہے۔ ہمارا تاثر اتنا خراب نہیں جتنا آپ لوگ سمجھتے ہیں ابھی ہمیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہے۔ میں ابھی بہار کے دورے سے واپس آیا ہوں اور مجھے علم ہے کہ عوام بڑی تعداد میں ہمارے ساتھ ہیں صرف پٹنہ جیسے شہروں میں کچھ لوگ جے پی کے ساتھ ہیں۔ دیہاتی علاقوں کے لوگ تو کانگریس کے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے اجلاس اور جلسے کوئی کسوٹی نہیں ہیں صرف انتخاب ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی رائے کیا ہے۔

س: حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ آپ روپے کے زور پر انتخاب پر اثر انداز ہوتے ہیں

ج: دوسری پارٹیوں کے پاس ہم سے زیادہ سرمایہ ہے بلیک منی جہاں جاتا ہے بذریعہ طلب رہ جاتا ہے انتخابی اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ سب پارٹیوں پر بھی یہ الزام ہے"۔

اس نے مجھے پھر جلسوں اور جلوسوں سے نتیجہ اخذ کرنے پر انتباہ کیا "پنجاب میں کیا ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ کی آواز پر سینکڑوں ہزاروں لوگ جلسوں میں آئے لیکن ووٹ انہوں نے اکالیوں کی بجائے کانگرس کو دیئے۔"

وہ جانتا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ بھی کھتری ہے۔ بھاپا۔ اس کی سب سنتے ہیں لیکن حکومت کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ صرف ایک جاٹ ہی حکومت کے لائق ہے۔ میں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے۔ ذیل سنگھ جاٹ نہیں ہے نہ ہی مسافر لیکن میں اسے اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ پٹڑی سے اتر کر مذہبی مسائل میں گھر جائے میں نے کانگرس پر اپنا حملہ جاری رکھا۔

س: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے جارج فرنینڈس کا چیلنج کیوں قبول نہ کیا۔ اس نے اپنے پرچے میں پارلیمنٹ کی بے انتہا توہین کی ہے اور کچھ ممبران اسمبلی کو دلال تک کہا ہے۔ کانگرس نے اس کا نوٹس نہ لے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری کانگرس کو منظور ہے۔

بروہا نے میری بات کو ایک مختصر اور ذو معنی فقرے سے رد کر دیا۔ "نہیں فرنینڈس شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ہم اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہتے تھے۔" اور پیشتر اس کے کہ میں اسے اس مسئلے پر اور زیادہ رگیدتا مگر اس نے کمال ڈھٹائی سے کام لے کر موضوع تبدیل کر دیا۔ "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔" وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کسی امیر خاندان کا فرد نہیں ہے۔ اس کا باپ ایک سکول ٹیچر تھا۔ آسام میں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں کسی کے پاس بھی چار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں۔ آسامیوں کو دولت کی اتنی پرواہ نہیں۔ زیادہ امیر لوگ روپے پیسے کے بل پر انتخاب نہیں جیت سکتے کیونکہ وہاں دولت طاقت نہیں خرید سکتی۔

بروہا کوئی ذات نہیں بلکہ ایک قسم کا عہدہ ہے۔ براہمن بروہے اور کھتری بروہے ہیں اور یہاں مسلمان بروہے بھی ہیں۔ قوم کے اعتبار سے میں کالستھ ہوں لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نہ ہی ذات پات کے فرق سے فرقہ بندیں

مجھ سے بہتر آسامی ہے جب ہندومت اور اسلام آسام میں داخل ہوئے تو مذہب کی گرہیں بنیاد مجروح ہو گئیں۔

س: میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اسے اس کے مذہبی اعتقادات کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

ج: میں مذہبی ذہن نہیں رکھتا۔ میں حقیقت پسند ہوں ہیں مذہبی رسوم کی پابندی نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان کی روایات "لبرل" ہیں۔ گذشتہ چار سالوں میں میں بنارس میں تھا لیکن میں ایک دفعہ بھی مندر میں نہیں گیا اور نہ ہی اشنان کرنے گنگا۔ لیکن مجھے موقع ملا تو میں نجف اور کربلا بھی ہو آیا

س: میرا خیال ہے انہوں نے آپ کو کعبے میں گھسنے نہیں دیا ہو گا۔

ج: اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور پھر اپنے مخصوص موضوع پر گفتگو کرنے لگا کہ کس طرح کھتری، پوتا پوتوں سے ملتے ہیں۔ سکندر اعظم کس طرح نجات دہندہ ثابت ہوتا ہے۔

س: میں اسے پھر بیسویں صدی میں لے آیا۔ اندرا گاندھی کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔

ج: اپنے باپ کی مانند وہ بھارت کی مقبول ترین لیڈر ہے۔ مسز گاندھی میں یا کانگرس کے کاموں میں کیڑے نکالنے کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ جب میں نے وزارت پٹرولیم و کیمیکل کا انتظام سنبھالا تو لوگوں نے کہا کہ ملک سے باہر کی زندگی بڑی سہانی ہے۔ میں ملک سے باہر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ جب میں روم میں تھا تو میں پکچر گیلری جانا چاہتا تھا۔ اگر ہڑتال نہ ہو اور عجائب گھر کھلتا ہو تو آپ وہاں جا سکتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے وہاں ہڑتال ہو چکی تھی اور گیلری بند تھی۔

وہ انڈونیشیا، ملائیشیا اور یورپی ممالک میں پیش آئے واقعات کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ میں ایک دفعہ پھر اسے گھیر گھار کر ملکی صورت حال

کی طرف کھینچ لایا۔

س: حکمران جماعت کا عوام کے دلوں میں کیا تاثر ہے اور آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیں گے۔

ج: تاثر کوئی طے شدہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک جاری عمل کا نام ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کو خوراک مہیا کرنی ہے۔ اگرچہ زراعت کا کاروبار نجی شعبے میں ہے تاہم حکومت کو اس سلسلے میں کارروائی کرنا چاہیئے اور خوراک محفوظ کرنی چاہیئے اور پھر اسے عوام میں تقسیم کرنے کے لیے باقاعدہ تنظیمی سطح پر کام کرنا چاہیئے"

یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ سیاست پر بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ اور اس کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے محبوب موضوع کی طرف پلٹ آیا۔ "کیا تم بھجا پا" ہو؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔

نہیں۔ میں کھوڑانہ ہو جیسے ہرگووند تھا جسے نوبل انعام ملا تھا۔ کیا بردہا کا لستھو ں میں سے بھی کسی نے نوبل انعام حاصل کیا ہے؟

"بردہا کالستھ" وہ ہنسی سے دوہرا ہو گیا۔ "وہ سب کے سب بے کار لوگ ہیں۔"

بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی

پاکستانی افواج کی بنگالیوں کی نسل کشی کی مہم کے نتیجے میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات کو مکتی فوج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ صرف دس ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی لیکن جلد ہی یہ گونو باہنی یعنی عوامی فوج آزادی کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے مسلح مرد و خواتین کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی اور لاکھوں ابھی اور شامل ہونے کے لیے تیار تھے امن پسند بنگالیوں کی ردعمل کو کچلنے کے لیے یہ فولاد کیسے تیار ہوا۔

۱۲ نومبر کی صبح کو برطانوی جھنڈا لہرائے سات ہزار ٹن وزنی سامان اٹھائے "سی آف سینٹ ایل نبز" دریائے ہوگلی کے دہانے سے برآمد ہوا۔ اور کلکتہ کی جانب آیا۔ اس کی فولادی دیواروں میں۔ چھوٹے بڑے سوراخ تھے اوپر سے لے کر نیچے تک۔ اگلے روز ایک مقامی اخبار نے تصویروں سے مزین کہانی شائع کی جس میں مکتی باہنی کے اس بحری جہاز کو نقصانات پہنچانے پر روشنی ڈالی گئی ریاست کی حکومت نے فوراً اس ایلیے پر سوچ بچار کیا کسی فوٹوگرافر کو اس کی تصویریں لینے کی اجازت نہ دی گئی اور صرف ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ جاری کیا گیا جس میں یہ بتایا گیا کہ جہاز پر کھلی مشرقی پاکستان کے ساحل پر حملہ کیا گیا ہے

میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھرے۔ کیا جہاز سامان لے کر مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ سامان کس قسم کا تھا۔ اس پر حملہ کس نیت سے کیا گیا کیا پاکستانی سمندری حدود میں یا بین الاقوامی پانیوں پر۔ حملہ آور کون تھے۔ کیا یہ واقعی مکتی باہنی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ تو پھر ان کے پاس فوجی بحری کشتی کہاں سے "کس" کی مدد سے انہوں نے حملہ کیا۔

چار روز بعد میں نے کاہڈن ریسچ کے علاقے میں جانے کا اجازت نامہ حاصل کیا

جہاں جہاز لنگر انداز تھا ساحل پر بہت سے مزدور اور کلرک پھر رہے تھے گودی مزدور جہاز سے مشینری نکال کر پرمٹوں سے اتر رہے تھے اور خوش گپیوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو کر اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے سوراخ گننے لگا چھبیس میرے قریب ہی ایک شخص نے زور سے کہا۔ "اتنے ہی دوسری جانب بھی ہیں۔" "تو یہ مکتی باہنی
میں نے اس سے پوچھا "آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا ہے کہ یہ مکتی باہنی کا کام ہے؟ اور کس کا ہو سکتا ہے" اس نے جواب دیا۔ "یہ تو ان کا کام ہے یا ہمارا۔ ان کی فتح ہماری فتح ہے اور ان کی شکست ہماری شکست ہے۔"

کچھ اثر و رسوخ اور کچھ کوشش سے میں نے جہاز کے اندر جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ رات گئے میں جہاز کے کپتان ہانس اور اس کی خوبصورت بیوی مسز روزمیری ہانس کے پاس بیٹھا واقعے کی تفصیلات حاصل کر رہا تھا کپتان ایک جیم شیم سکاٹش تھا اور اس واقعے سے اسے جو شہرت حاصل ہوئی اس کا مزہ لے رہا تھا۔ "میں گذشتہ ہفتے تک برطانوی بیڑے پر تھا۔ میں نے بذات خود کچھ نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی میں اس واقعے کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں جب تک کہ انکوائری ختم نہیں ہو جاتی ہمارا بحری اتاشی دہلی سے پہنچ چکا ہے اور اس نے تمام نقصان کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔" کپتان نے کہا پھر اس نے مجھے بتایا کہ کیا ظاہر ہو چکا ہے سی اف آل نیز تھوڑی دیر پہلے ہی سامان اتارنے کلکتہ آیا تھا اور انوبر کو پچھلے پہر کو لنگر اٹھا لیا گیا اور جہاز خلیج بنگال میں تیرتا ہوا مشرقی پاکستان کی دوسری بڑی بندرگاہ چالنا کی طرف روانہ ہوا جہاں سے اسے پٹ سن لادنا تھی۔ تقریباً ساڑھے ایک بجے کوئی گن بوٹ یا زیادہ گن بوٹس کسی نامعلوم علاقے کی طرف سے آئیں اور انہوں نے جہاز کو چھلنی کر دیا۔ "دس منٹ کی یہ ایک خوفناک واردات تھی" — روزمیری ہانس نے کہا۔ "مجھے اس کا تجربہ جنگ عظیم دوم میں ہو چکا ہے" کپتان نے بات جاری رکھی۔ "لیکن اگر کوئی کہے کہ وہ اس واقعے سے خوفزدہ نہیں ہوا تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے میری آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جہاز کا رخ موڑا اور واپس کلکتے کی جانب روانہ ہو گیا"

"سوراخ سائز میں ایک جیسے ہی ہیں کیا خیال ہے ایک ہی ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً پام۔ پام؟" میں نے پوچھا

"نہیں سوراخ ایک جیسے نہیں ہیں۔" کپتان نے کہا۔ "میں اسلحے کا ماہر تو نہیں تاہم اتنا ضرور اندازہ ہے کہ ایک سے زائد ہتھیار استعمال ہوئے ہیں۔ ہم نے کچھ خول اکٹھے کیے ہیں اور بحری اتاشی کو دیے ہیں۔"

"اس سے کوئی نتیجہ نکلا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔ مجھے فی الحال کسی پر بھی شبہ نہیں۔"

کرنل محمد عطا الغنی عثمانی مکتی باہنی کا کمانڈر انچیف ہے۔ وہ پچاس سال کا ایک دبلا پتلا آدمی ہے۔ اس کی سیاہ رنگت پر سفید مونچھیں برش کی مانند سفید ہو چکی عجیب لگتی ہیں۔ وہ کرنل [illegible] کے انداز میں صاف اور شستہ انگریزی بولتا ہے اس کی گفتگو میں اینگلو انڈین ملٹری سٹائل کی مانند "ونڈرفل" "بیکار" اور "جالی گڈ" کے الفاظ کثرت سے سننے میں آتے ہیں۔ سختی اور غمگینی اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہے جو ایک گھنٹہ میں نے اس کے ساتھ گزارا اس میں اسے مسکراتا ہوا نہیں دیکھا۔ اپنی رزمیہ جنگوں اور اپنے جوانوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ جب وہ پاکستانی فوج کے جرنیلوں پر ظلم و ستم کی بات کرتا تو اس کی آنکھوں میں نفرت کا الاؤ ہوتا تھا۔

کرنل عثمانی تک پہنچنا آسان نہیں۔ جب بھی ان کے بارے میں پوچھا جائے ایک ہی روز پتہ ملتا ہے۔ "کسی جگہ بنگلہ دیش کے اندر ہی۔"

مجھے اس کی جھونپڑی تک ایک نگرانی میں لے جایا گیا۔ وہ ایک کرسی پر بڑے خبردار طریقے سے بیٹھا تھا اور ایک گیس لیمپ اس کے سر پر روشن [illegible] اس کے سامنے کی میز بالکل خالی تھی۔ اس کی جھونپڑی کی دیوار پر تصویروں یا کیلنڈروں سے مزین نہیں تھی حتیٰ کہ شیخ مجیب الرحمن کی تصویر بھی نہیں تھی اس نے بڑی درشتی سے ہاتھ ملایا اور بغیر وقت ضائع کیے پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں

میں نے سی آف آل میزرز کے بارے میں پوچھا۔ کرنل عثمانی کو اس جہاز کے محل وقوع اور ایک غیر مسلح جہاز پر باغیوں کی جانب سے [illegible] حملے کے بارے میں مکمل آگاہی تھی۔ یہ ہمارے پانیوں میں تھا اور بغیر اجازت کے آیا تھا اور ہمارے دشمن کے ساتھ تجارت کر رہا تھا۔ محض ایک جہاز کو نقصان پہنچنے پر دنیا واویلا کر رہی ہے۔ یہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب پاکستانی حملہ آور معصوم مردوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر رہے تھے بچوں اور عورتوں کا قتل عام ہو رہا تھا زنا ہو رہا تھا لوٹ مار مچی تھی اس وقت کسی قوم کو یہ خیال نہ آیا کہ ان کو روکا جائے۔ اس وقت بین الاقوامی اخلاقیات کہاں سو چکی تھی۔ بتائیے؟"

میں نے جہاز کا ذکر چھوڑنا نامناسب سمجھا اور مکتی باہنی کی بنیاد کی طرف آیا

اس کا ظہور ۲۵ اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو ہوا جب پاکستانی فوج نے بنگالیوں کو فرقہ وارانہ دہشت پسند عناصر قرار دے کر ختم کرنے کی مہم شروع کی۔ ان کے مقابلے میں ہمارا ارادہ کوئی فوج کھڑی کرنے کا نہیں تھا۔ میں ایک سپاہی ہوں اور میں اس روایت پر عمل کرتا ہوں کہ فوج کو سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات میں نے پہلے کسی کو نہیں بتائی جو آپ کو بتا رہا ہوں۔ ۱۹ مارچ کی شب جب یہ افواہ ملی کہ پاکستانی افواج بنگالیوں کا قتل عام کرنے والی ہیں تو شیخ مجیب الرحمان نے مجھے سینئر بنگالی افسروں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کو کہا تاکہ ہر قسم کی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے تیار رہا جائے۔ میں نے ایک با اعتماد ساتھی میجر خالد مشرف کے ذریعے ایک خفیہ سرکلر ان افسروں کو بھیجا۔ میں نے تین واضح نکات پیش کیے۔

۱۔ سیاست میں ملوث نہ ہوں۔

۲۔ کسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں۔

۳۔ جارحیت کا جواب سرکوبی سے دیں۔

اگر پاکستانیوں کی سرگرمیاں صرف بنگالی سیاستدانوں تک ہوتیں تو بنگالی افواج غیر جانبدار رہتیں۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہر قابل بنگالی اور سینئر افسر کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے تو پھر ہم نے پاکستانی فوج ہی پر مشتمل مکتی باہنی بنائی۔ اس طرح ہم نے

انقلاب دے۔ کرنل عثمان نے مجھے کسی انفرادی شخصیت کا نام نہیں بتایا لیکن ہمایوں رشید چوہدری جو اکتوبر ۷۰ء تک دہلی میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر رہا اور پھر بنگلہ دیش بھی اس نے مجھے بتایا کہ فوجی کارروائی سے کئی ہفتے پہلے سینئر بنگالی افسروں کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ان کو بہتر اہم جگہوں پر تعینات کر کے جوانوں کے ہاتھ میں کمان دے دی گئی تھی۔ میجر عثمان چواڈنگا، میجر خالد مشرف کومیلا اور میجر ضیاء کو کہیں چٹاگانگ کے آس پاس تعینات کیا گیا۔ بنگالی فوجیوں اور پولیس کے سپاہیوں نے ان نوجوان افسروں کو اپنا آقا تسلیم کیا اور اس طرح تقریباً دس ہزار تربیت شدہ افراد کی ایک فوج تیار ہو گئی ان لوگوں نے کرنل عثمانی کو اپنا کمانڈر انچیف مقرر کیا جو پہلے ہی عوامی لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کی رکنیت حاصل کر چکے تھے۔

مکتی باہنی کے کئی گروپ تھے۔ ان کی سیاسی قیادت شیخ مجیب الرحمن کی عوامی پارٹی کے ممبران کرتے تھے ان میں سے بیشتر چالیس اور پچاس کے دہاکوں میں تھے اور اگرچہ ان میں ہتھیار اٹھانے کی سکت نہیں تھی تاہم لوگوں نے اُن کو حوصلہ دے رکھا تھا وہ دسمبر ۷۰ء کے انتخاب میں قومی اسمبلی کے لیے ۱۶۹ میں ۱۶۷ نشستیں جیت چکے تھے۔

فوجی گروپ میں ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز، پولیس، انصار اور مجاہدین پر مشتمل تھا۔ ۲۵ مارچ کے قتل عام میں یہ دس ہزار جوان بچ گئے تھے یہ فوجی دستہ غیر سیاسی تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو اپنے ہی رنج تھے مثلاً بنگالیوں سے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو ترقی دینے کا رنج۔ زیادتیوں اور جبر کا رنج، اگر پاکستانی فوج انہیں نہ چھیڑتی تو شاید یہ بھی الگ ہی رہتے۔

تیسرا گروپ رضاکاروں پر مشتمل تھا۔ جو لوگ جسمانی طور پر اس قابل نہیں تھے انہوں نے الگ گروپ بنایا۔ اس میں اکثریت سکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی تھی جن کی عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔

اس گروپ پر سیاسی نظریات نے زیادہ اثر دکھایا۔ دو کمیونسٹ پارٹیاں تھیں پیکنگ نواز پارٹی کے لیڈر بھاشانی تھے اور ماسکو نواز پارٹی مظفر گروپ کہلاتی تھی۔

فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور بھی اپنی اپنی ٹریڈ یونین کے حوالے سے ان پارٹیوں میں شامل تھے۔ اگست ۱۹۷۰ میں بائیں بازو کے اتحاد کی کوشش کی گئی اور کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی آف لیفٹ یا سی۔ سی۔ ایل کی تشکیل دی گئی۔

مزید ایک گروپ طالب علم راہنماؤں اور ان کے پیروکاروں پر مشتمل وجود میں آیا۔ ان کے دو واضح طالب علم لیڈر تھے۔ حفیظ احمد اور فضل الحق مرنی۔ انہوں نے زیادہ اچھی اور بہتر فوجی تربیت حاصل کر رکھی تھی اور بنگلہ دیش میں ان کی حیثیت ایک طاقت کی مانند مانی جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجیب باہنی کہتے تھے۔ میں مکتی باہنی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ کرنل عثمانی نے اعداد و شمار بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ "میں اسے گونو باہنی یعنی عوامی فوج آزادی کہتا ہوں کیونکہ ہر بنگالی ایک سپاہی ہے" کرنل عثمانی نے کہا بہت سے سرکاری حلقوں کے مطابق یہ تعداد پچاس سے ساٹھ ہزار کے درمیان تھی جو بجائے ایک لاکھ پچاس ہزار ہو گئی پہلے پہل یہ صرف اور صرف مسلمان فوج تھی بعد میں تقریباً تین ہزار ہندو بنگالی اس میں شامل کیے گئے۔

ہو سکتا ہے کہ بنگالی صحیح سپاہی ثابت نہ ہو سکے ہوں لیکن انہوں نے بم بازی، بارود اور پستول کے استعمال میں اپنا فطری رجحان ثابت کیا۔ برطانوی راج کے دوران بنگالیوں نے ہندوؤں کی نسبت کہیں زیادہ برطانیوں کو دہشت گردی کے ذریعے قتل کیا تھا اور ان میں سے بہت سوں کا تعلق مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کے موجودہ علاقوں سے تھا۔ کسی باقاعدہ گن مین یا بم باز کو مکمل طور پر گوریلا بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

مغربی پاکستان کی پنجابی اور پٹھان حکومتوں نے بنگالیوں کے خلاف امتیاز روا رکھا۔ انہوں نے ایسٹ بنگال رجمنٹ اور آرمڈ کانسٹیبلری کا کچھ کچھ خیال نہ کیا اور بہت ہی کم بنگالیوں کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی۔

۱۹۷۰ تک صرف ایک لیفٹیننٹ جنرل تھا کسی بنگالی کو نیوی یا ایئر فورس میں مغربی پاکستان کے مطابق رینک نصیب نہ ہوا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے ایک پنجابی پاکستانی دوست سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی علاقے کی آبادی کل آبادی کا ۵۶ فیصد ہے

لیکن فوج میں صرف سات فیصد افراد کیوں ہیں۔ تو اس نے ناک سکیڑتے ہوئے نفرت سے کہا "یہ دال بھات کھانے والے لوگ لڑنا کیا جانیں۔ فوج کوئی بھیڑوں کا گلہ نہیں ہو گی"۔

معظم چوہدری جس کا تعلق سلہٹ سے تھا اور جو شیخ مجیب الرحمن کا دوست تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بنگالی نوجوانوں نے اپنے آپ کو فولاد کیسے بنایا — "تم جانتے ہو کہ ہم امن پسند لوگ ہیں ان پنجابیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کی درندگی نے ہمیں لڑنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کی پرواہ نہ کی۔ ایک ذلیل سے ذلیل جانور اپنے گلے اور اپنے خاندان کی حفاظت کرتا ہے۔ نفرت لوگوں کو لڑائی پر مجبور کرتی ہے" — یقیناً بنگلہ دیشیوں کے ذہنوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"اپنے ان امریکی دوستوں کو بتا دینا" کرنل عثمانی نے کہا "کہ جو کچھ پاکستانی فوج نے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو کیا وہ سو MY LAIS سے بھی زیادہ ہے۔ جب تک ہم ان کا صفایا نہیں کر لیتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے ان کی لاشیں بنگلہ دیش میں ذلیل ہوں گی اور ہم ان کے بھوت مغربی پاکستان بھیجیں گے"

مجاہدین آزادی تعداد اور فوجی استعداد میں ترقی کرتے گئے۔ دو ماہ کے بعد اس کا نام مکتی فوج سے تبدیل کر کے مکتی باہنی (تنظیم) کر دیا گیا اس تنظیم کا دائرہ کار اتنا وسیع تھا کہ ہر شخص گوریلے کی مانند جانبازوں، کشتیوں اور دریاؤں کے پلوں کو تباہ کر سکتا تھا گروپ کیپٹن خوندکار، بنگلہ دیش ایئر فورس کا ایئر مارشل مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ان کے پاس بہت سے پائلٹ تھے تاہم ان کا کوئی جہاز بھی اپنے ہینگر میں نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان اور بھارت کے بارڈر کے ساتھ مکتی باہنی کے تین ٹریننگ گروپ تھے۔ حفاظت کی خاطر ان سنٹروں کے نام کبھی نہیں بتائے گئے اور صرف یہ جواب ملتے کہ بنگلہ دیش کے اندر کسی جگہ۔ اسی طرح تربیت دہ تنظیم کو بھی خفیہ رکھا گیا۔ آپ سمجھ لیں کہ برائے نام ہی گوریلا تنظیم کی تربیت بھی ایسے نہیں کی گئی جو کرنل

عثمانی نے کہا پہلے پہل میں نے اپنی فوج کو روایتی فوجی شن کی تربیت دی اور ہم روایتی فوجی لڑائی لڑے۔ ہمارا خیال تھا کہ غیر ملکی مداخلت کی وجہ سے یہ لڑائی ترک جائے گی اور پاکستانی فوجوں کو واپس جانے کے لیے کہا جائے گا لیکن جب ایسا نہ ہوا اور پاکستانی فوج کی تعداد اسی ہزار ہو گئی جن کے پاس ٹینک، بھاری توپیں اور بم تھے تو ہم نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی۔ ۲، مئی ۱۹۷۱ء کو میں نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی اور انہیں گوریلا لڑائی کی تربیت دی ہمیں زمین کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنے مخالفوں کو شکست دے کر مجبور کر دیا کہ وہ دیہاتوں کی طرف بکھر جائیں۔ ہم نے ان کے ذرائع رسل و رسائل ختم کر دیئے۔ انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ ہم ہر روز ایک سو کے قریب لوگوں کو مارتے تھے اور ان کے جہاز لفٹوں سے بھرے ہوئے واپس جاتے تھے۔ ابھی کل ہی میرے ایک کمانڈر نے کامیاب حملے کے بعد کو میدا سے چینی اور امریکی ساخت کا اسلحہ حاصل کیا ہے —"

ٹریننگ کیمپ میں ملاقاتی لڑکوں کو صرف انڈر ویر پا لنگی میں ورزش کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ ان لڑکوں کے ہاتھ میں لکڑی کی بندوقیں ہیں۔ اصل ہتھیار کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں جب ان سے پوچھا جاتا کہ یہ اسلحہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا تو جواب ملتا کہ دشمن سے یا پھر سپاہی اور فوجی بغاوت کے بعد اپنے مرکوں سے یا پھر اپنے بیرونی دوستوں سے بھی خریدا گیا ہے" وہ کہتے —

جب میں نے کرنل عثمانی سے پوچھا کہ آپ بارودی سرنگیں اور فوجی گن بوٹ بنگلہ دیش میں کہاں سے آئیں تو اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا" میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تربیت کا عرصہ چند ہفتوں سے چھ ماہ تک کام کی نوعیت کے مطابق پھیلا ہوتا تھا کسی گاڑی کو بڑی سے اتارنا یا سڑک پر بارودی سرنگ لگانا۔ بہت آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے ایک مارٹر یا سٹین گن چلانے کی تربیت یا پانی کے نیچے تیرتے ہوئے بارودی سرنگیں بچھانا زیادہ مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

"فتح و شکست کی فتح کے دعوے کی تصدیق بڑی مشکل ہے —" کرنل عثمانی نے کہا۔

ستمبر ۱۹۷۰ء تک ہم پچیس ہزار پاکستانی سپاہی قتل کر چکے تھے۔ اکیس جہاز ڈبو دیئے اور ۷۰۰ دریاؤں کے پل مکمل طور پر تباہ کر دیئے ریل کی پٹریاں اتار دیں سڑک، دریا، پل اور بحری رسد کو تباہ کر دیا۔ آپ خود تصدیق کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں صرف چند گاڑیاں چل سکتی تھیں اور چاٹگام کی بندرگاہ مکمل طور پر بند تھی۔

بھارت کی دفاعی ضروریات کی تعلیم گاہ کے تجزیے کے مطابق بنگلہ دیش میں قتل ہونے والے پاکستانیوں کی تعداد ...۶ کے قریب ہے۔ حکومت پاکستان کی مکتی باہنی کے خلاف نشری مہم زری بنگلہ دیش ریڈیو اور کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک اخبار کی بنا پر دب کر رہ گئی جو حال اصراحت نے دو باختر دار سے مزدور موجود تھے جہازوں پر موجود بنگالی عملہ جو مشرقی پاکستان سے آیا تھا۔ غیر ملکی ریڈیو، ٹی وی اور اخبار کے نمائندے جنہیں بلا تکلف ڈھاکہ سے باہر جا کر حالات کا خود جائزہ لینے کی اجازت تھی بنگالی بحری عملے کے پاس جہازوں کے تباہ ہونے کی بے شمار کہانیاں تھیں ستمبر ۱۹۷۱ء کے تیسرے ہفتے میں سولہ ہزار ٹن وزنی برطانوی ٹینکر T R U C T B S N L کو چٹاگانگ کی بندرگاہ پر بے اندازہ نقصان ہوا اس کے فوراً بعد ایک دس ہزار ٹن وزنی برطانوی جہاز "چاکدینا" تباہ ہو کر کلکتہ کی بندرگاہ پر مرمت کے لیے جلا گیا ان لوگوں نے نئی پاکستانی سٹیمر اور کوسٹل ٹینکر بندرگاہوں پر اُلٹے پڑے کوئی حسن کی حالت میں دیکھے ۱۴ اگست یعنی پاکستان کے یوم آزادی پر ... H P ... پر حملہ کامیاب کیا گیا۔

اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء کے دوران مکتی باہنی کے کمانڈوز نے اپنی سرگرمیاں مسلسل رکھیں ۹ اکتوبر کے روز مغربی پاکستان کے ... ملنے والے ڈھاکہ کے مرکزی حبیب بنک میں بم کا دھماکہ ہوا اس عمارت میں ورلڈ بینک کا ایک دفتر بھی واقع تھا جس کو شدید نقصان پہنچا۔ اور ایک پٹ سن کا گودام جل کر راکھ ہو گیا۔ بھارتی تجزیہ نگاروں کے مطابق زمانہ امن میں بنگلہ دیش میں ذرائع نقل و حمل ۲۸ فیصد دریا کے ذریعے ۴۴ فیصد سڑک کے ذریعے تھے موجودہ حالات میں وہ دس فیصد سے کم رہ گئے تھے ... ذرائع رسل و رسائل بالکل ناکام تھے [illegible] پاکستان کی [illegible]

صنعت تھی۔ اس کی نقل و حمل کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ صنعتی پیداوار عام حالات سے ۳۵ فیصد کم ہوگئی۔ تمباکو کی پیداوار دس فیصد کم ہوگئی۔ چائے کے گیارہ باغ جو سرحد کے قریب تھے بند ہوگئے باقی کی پیداوار میں ۲۵ فیصد کی ہوگئی۔ یہ سب مکتی باہنی کو بتایا گیا تھا جس کے بارے میں ڈھاکہ کے پاکستان آبزرور کا خیال تھا کہ "یہ موت اور تباہی کی ایک بے رحم تنظیم ہے جو ملک میں افراتفری مچا رہی ہے اور بدامنی اور بے یقینی کے حالات پیدا کر رہی ہے۔"

بنگلہ دیشی کمانڈوز کی فتح کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ بھارتی صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو بالجبر بنگلہ دیش کے باہر اکٹھا کر لیتے تھے اور مدعو کرتے تھے۔

میری آخری ملاقات اس وقت کے وزیر خارجہ بنگلہ دیش کے اخوند کر مشتاق احمد سے ہوئی۔ جب میں اس کے پی اے کے کمرے میں پہنچا تو یہ ملاقاتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں سوویت صحافیوں کی ایک ٹیم کو بنگلہ دیش کے بارے میں تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔ نقشے کی مدد سے بتایا جا رہا تھا کہ مکتی باہنی کس کس علاقے پر قبضہ کر چکی ہے۔ بنگلہ دیش کے نقشے میں کیا ہے۔ پاکستانی فوج کہاں ہے۔ ترجمان سوالوں کا مطلب بتا رہا تھا۔

"صحیح اور درست علم تو ابھی مشکل ہے۔" ترجمان نے کہا۔ "جہاں پاکستانی فوج فی الحقیقت موجود ہے وہ علاقہ ان کے پاس ہے اور باقی کا علاقہ ہمارے قبضہ میں ہے رات کو وہ تمام بیرکوں پر تالے ڈال دیتے ہیں جن میں وہ سوتے ہیں۔ ہمارے جوان ان کے ساتھ براہ راست مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس ٹینک اور طیارے ہیں جبکہ ہمارے جوانوں کے پاس صرف رائفلیں، گرنیڈ، اسٹین یا مشین گن ہیں جونہی ہمارے پاس اسلحے کی تعداد میں اضافہ ہوا ہم ان کا مقابلہ کھلے میدان میں کریں گے اور اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

[illegible] ہوئی۔ سوویت پارٹی کے لیڈر نے ایک مختصر سی تقریر کی اور کہا کہ [illegible] بہرحال فتح حاصل کر رہی ہے۔ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملانے اور جھک کر

[illegible] بجا لانے کے بعد روسی "طائفہ" جے بنگلہ دیش کے نعرے لگاتا ہوا چلا گیا۔

خوندکر مشتاق احمد بڑا خوش لباس آدمی ہے وہ بنگلہ دیش کی کابینہ کا سب سے بااثر وزیر ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے لیے سگریٹ رول کر رہا تھا "یہ رمضان کا مہینہ ہے۔" میں نے اسے یاد کرایا۔ "آپ روزے سے نہیں۔" وہ مسکرایا "مجھے معلوم ہے اور شب برات بھی آج ہے لیکن جہاد کے دوران روزے کی معافی ہے یہ ہماری جنگ آزادی جہاد ہے۔"

ہم دیر تک بنگلہ دیش کے بارے میں غیر ملکی ردعمل پر باتیں کرتے رہے اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور کہنے لگا: "میرے دوست! ہم کبھی نہیں بولیں گے کہ بھارت نے آزمائش کی اس گھڑی میں ہمارے لئے کیا کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دس ملین لوگ بھارت میں پناہ گزیں ہیں اور بھارت انہیں خوراک اور دیگر چیزیں مہیا کر رہا ہے آزاد بنگلہ دیش دائمی دوستی کے معاہدے کی صورت میں یہ قرض اتار دے گا۔"

"قوموں کی یادداشت زیادہ تیز نہیں ہوا کرتی۔" میں نے کہا وزیر خارجہ ششدر رہ گیا پھر بولا "کیا امریکہ نے اپنی آزادی کی جنگ کے دوران فرانس کی مدد بھلا دی ہے! نہیں ہم اپنے دوست بھارت کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس کا مطلب خود اپنے آپ کو بھلا دینا ہوگا۔"

نراڈ چوہدری

"کل صبح دس بجے آجاؤ ——" مجھے توقع نہیں تھی کہ نرادچوہدری سے اتنی آسانی سے انٹرویو کا وقت مل جائے گا۔ وہ نوجوانوں کی ایک دعوت میں تھا۔ وہ اسے تنگ کر رہے تھے لیکن وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لڑکے اس کی جنس کے بارے کتاب "THE CONTINENT OF CIRCE" کے ریفرنس کے بارے پوچھ رہے تھے وہ نہایت جوشیلے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تمام اطراف میں گردش کر رہے تھے اس کی نازک سا جسم اوپر نیچے پھلانگ لگا رہا تھا ایک لڑکی پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ لڑکیوں کے ملازمت کرنے کے خلاف کیوں ہے۔ "ہر خاندان کو مہذب لوگوں کی طرح ایک ہی کمانے والے کا محتاج ہونا چاہتے ہو عورتوں کو وہ کام کرنا چاہیئے جو قوم کے مستقبل کے لیے ضروری ہے —— ایک مہذب گھریلو زندگی اور بچوں کی نشوونما، دانش اور تعلیم و تربیت —— ایک مہذب قوم کے لیے عورتوں کے لیے کمائی کرنے سے زیادہ یہی کام اہم ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہندوستانی قوم کا قدیم اشرافیہ کا نظریہ کیا تھا —؟ اعلیٰ ترین مرد بے پناہ محبت کرتا ہے اور بے پناہ بہادر ہوتا ہے اور اعلیٰ ترین عورت صرف بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اور میں اس سے بالکل متفق ہوں ــ"

اس کے جواب میں گہری خاموشی ہوتی ہے۔ ذرا زیادہ عمر کے لوگ جو ذرا فاصلے پر کھڑے ہیں آخری الفاظ سنتے ہیں۔ وہ اسے غصے کی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں کہ یہ بوڑھا ہماری نوجوان نسل کو خراب کرتا ہے۔

لیکن جوان لڑکی بضد ہے۔ وہ جلدی جان چھوڑنے والی نہیں "مسٹر چودھری آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ متضاد بات نہیں کر رہے —— میں نے آپ کا ایک آرٹیکل

پڑھا تھا جس میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ مرد کی نسبت ہندوستانی عورت زیادہ مہذب ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر عورت صرف محبت کے لیے مخصوص کیوں ہو ——"

ایک شریر مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آتی ہے۔ اُسے اس بات پر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ لوگ اسے غور سے پڑھتے ہیں لیکن وہ محصور ہوتے ہوئے بھی نہیں ہارتا۔

"کیا تمہیں علم ہے شادی کے وقت میں نے اپنی بیوی سے کیا کہا تھا —؟ میں اس سے زیادہ ذہانت رکھتا ہوں۔ میں بہانہ بازی برداشت نہیں کر سکتا خاص طور پر ذہنی بہانہ بازی وہ بھی عورت کی جانب سے۔ عورتیں ان معاملات میں مردوں کی نسبت زیادہ غیر سنجیدہ ہوتی ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں کی تعلیم کم ہو اگر کوئی عورت تعلیم حاصل کرے تو وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہی زیادہ باشعور اور حالات کو سمجھنے والی گردانتی ہے —— لیکن —— تم ذرا مختلف ہو۔ جوان لڑکیاں بہرحال کم حساس نہیں ہوتیں فرض کرو اگر خاوند مر جاتا ہے اور بھارت میں بیوہ کے لیے دوبارہ شادی کرنا ممکن نہیں تو پھر وہ اپنے بچوں اور اپنی زندگی کے لیے کیا کرے۔"

نراد چودھری ہنستا ہے۔ "اتنی سنجیدہ نہ ہو۔" وہ ایک امریکن کی طرف رُخ موڑتا ہے "عورتوں کا کام کرنا جس طرح کہ وہ تمہارے معاشرے میں آتی ہیں صدیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔" وہ فوراً موضوع تبدیل کرتا ہے "جانتے ہو کل میں نے امریکی طلباء سے کیا کہا —— میں نے کہا کہ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے مستقبل کے نمائندوں سے خطاب کرنے آیا ہوں تمہیں معلوم ہے دہلی میں امریکی سفارت خانہ وائٹ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے ——" امریکی شرم سے مسکراتا ہے۔

ہندوستانی صرف جبر کی حالت میں محنت کرتے ہیں —— بالکل اس طرح جس طرح انگریزوں نے ہم سے محنت کروائی اور ہمارا بہترین جوہر حاصل کیا۔ امریکی بھی آئندہ پچیس سے چالیس سال کے دوران یہی کریں گے۔ تہذیب ہندوستان میں دوبارہ رائج ہوگی لیکن اس کے آلات ہمارے نہیں ہوں گے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے ۱۹۴۰ء کا دفعہ ہمارے لیے ایک بڑی خوش قسمتی تھی زیادہ تر قومیں اس سے نابلد ہی رہتی ہیں

ہم نے بیس سال ضائع کر دیتے ہیں اور اب امریکیوں کا آنا ناگزیر ہے یہ مایوس نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور میں اس کا استقبال کروں گا کیونکہ اسی میں قوم کی بقا ہے۔"

"کیا ہم خود کچھ نہیں کر سکتے ۔" کوئی پوچھتا ہے۔

"نہیں ۔ ہندوستان کے ہر دس میں سے نو افراد کوئی پیداواری کام نہیں کرتے وہ سب طفیلی ہیں۔ وہ معاشرے سے باہر رہتے ہیں۔ کلکتہ میں مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا کلکتہ کا کوئی مستقبل ہے؟ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ سوائے اس کے کہ آدھی سے زیادہ آبادی شہر سے باہر نکل کر گاؤں میں جا کر کام کرے کلکتے کی تباہی کا بڑا باعث بنگالی انٹیلی جنس کی سست رفتاری اور صرف تنخواہ کھانے کا رویہ ہے اگر آپ کسی بنگالی یا ہندو کو کہیں کہ آپ اس کے لیے ملازمت مہیا کر رہے ہیں تو وہ فوراً معاوضے اور کام کے اوقات کا حساب سوچنا شروع کر دے گا۔ وہ غالباً ایسی ملازمت بہتر سمجھے گا جہاں پیسہ نسبتاً زیادہ اور کام کم ہوگا۔

دعوت اختتام کے قریب ہے لیکن نراد چوہدری کے پرستار ابھی تک سوالات پوچھنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے جرات مندانہ نقطۂ نظر کی تعریف کرتے ہیں اس کے سنکی انداز کو پسند کرتے ہیں وہ فرد فرید ہے اس کے اندر ہمارے دوسرے بزرگ لیڈروں کی طرح معذرت خواہانہ انداز نہیں۔ وہ نوجوانوں سے گفتگو کے دوران ایسا شعلہ پیدا کرتا ہے جو جوانوں اور بزرگوں کی عمروں کے فرق کو مٹا دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کے تمام دوست تیس سال سے کم عمر کے ہیں اور جو لوگ اس سے بڑی عمر کے ہیں وہ اس کے دوست اس وقت بنے تھے جب ان کی عمریں تیس سال سے کم تھیں ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے۔

ایک لحاظ سے نوجوان نسل نراد چوہدری پر رشک کرتی ہے۔ نراد چوہدری نارض نوجوان نسل کے افراد میں ناراضی بوڑھا آدمی ہے۔ اگلے روز میں اس سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں دہلی کے پرانے شہر کی دیواروں کے ساتھ کشمیری دروازے پر پہنچتا ہوں۔ تم میری کھڑکی میں سے جمنا کا شہر دیکھ سکتے ہو" وہ کہا کرتا تھا۔ میرا

خیال تھا کہ اس کا گھر دریا کے کنارے ہوگا۔ اس کی بجائے میں نے اپنے آپ کو غلیظ علاقے میں لوگوں سے گھرا ہوا پایا۔ غالباً میں غلط سمت میں آ نکلا تھا۔

قریب ہی مجھے پنجاب روڈ ویز" کا بورڈ نظر آیا۔ میں ایک سکھ سے جو قریب ہی ایک کار کی مرمت میں مصروف ہے نراد چوہدری کے بارے پوچھتا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سکھ اس نام سے واقف نہیں۔ پھر میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ ایک مشہور لکھاری ہے اور اس کا حلیہ وغیرہ بتاتا ہوں ۔ ایک کھسیانی سی ہنسی اس کے چہرے پر آتی ہے وہ بنگالی بابو ۔ چھوٹا سا، سوکھا ہوا ۔ ہاں ہاں ۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ایک ٹھڑکی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اس کا نام جانی واکر ہے ۔" ایک شریر بچے کی آواز آتی ہے مجھے بعد میں پتہ چلا کہ نراد چوہدری کا نک نیم اس علاقے میں جانی واکر تھا۔

کیا تم تھوڑا سا پنیر لینا پسند کرو گے۔ فرانس سے درآمد شدہ طیارے کے ذریعے یہ دو دن میں یہاں پہنچتا ہے لیکن تین دن کسٹم والے لگا دیتے ہیں ۔ میرے پاس کچھ وادکا بھی ہے پولش وادکا ۔ یہ روسی وادکا سے بہتر ہے ۔" وہ مجھے اپنے شراب خانے میں لے جاتا ہے۔ وہاں وائن سپرٹ اور شراب کی بے شمار قسمیں ہیں وہ ایک بوتل اٹھاتا ہے ۔ شاتو لاتور ۔" دنیا کی بہترین شرابوں میں سے ایک ۔ ۱۹۵۴ ۔ ایک اچھا سال ہے ۔"

وہ ایک خوبصورت گلاس میں وادکا انڈیلتا ہے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں وہ ایک اور بوتل اٹھاتا ہے اپنی انگلی سے اس کا کاگ اڑاتا ہے اور اسے میرے کان کے قریب لاتا ہے ۔ سنو ۔ کسی خالص آواز ہے ۔"

چھوٹا سا کمرہ کتابوں سے اٹا پڑا ہے۔ کچھ جرمن کتابیں بھی ہیں ۔ میں ایک دن میں صرف تین گھنٹے لکھنے میں گذارتا ہوں۔ باقی وقت میں پڑھنے، سیر کرنے یا موسیقی سننے میں گذارتا ہوں ۔" میری نظر ایک بہت اعلیٰ اور قیمتی THORENS سیٹ ریکارڈ پلیئر پر پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک قدیم لانگ پلے گراموفون بھی رکھا ہے

نوجوان کے علاوہ زیادہ لوگ مجھے ملنے نہیں آتے ۔ یہ ایک غریب اور سادہ

علاقہ ہے اور شاید لوگ یہاں آتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں لیکن میرے گھر کے باہر اکثر اوقات بڑی بڑی D.C کاریں کھڑی ہوتی ہیں —" وہ فخر سے کہتا ہے۔ "میں غیر ملکیوں سے زیادہ اچھی طرح مکس اپ ہوتا ہوں۔ ہندوستانی ان کی نسبت کم ایبزرجوتے ہیں —" اس کے یہ ریمارکس میری سانس بند کرنے کے لیے کافی تھے۔ بلاشبہ امارت پرستی کہا جا سکتا ہے لیکن امارت پسند تو ایسے گفتگو نہیں کرتے۔

قریب ہی شادی کا ایک دعوت نامہ رکھا ہے۔ وہ محسوس کر لیتا ہے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ "میں یہ صرف وصول کرتا ہوں — میں وہاں جاتا نہیں۔ شادی کے موقع پر ہزاروں کارڈ تقسیم کرنا ایک قسم کا احمقانہ کام ہے لوگ ان مہمانوں کے آگے جو ک ایسے پھینکتے ہیں جیسے کتوں کے آگے۔ اور پھر امیر، بااثر اور غریب مہمانوں میں تمیز روا رکھنا اس سے بھی بدتر بات ہے —"

"کیا ہمارے راہنما اس قسم کی باتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہے —" میں پوچھتا ہوں۔

"کیا تم جانتے ہو کہ دعوت نامے میں اصل مضمون کیا ہوتا ہے۔ فلاں فلاں بلا رہا ہے اور بریکٹ میں کچھ وفاقی وزیر بھی متوقع ہیں۔"

"اگرچہ ہم اپنے آپ کو روحانی کہتے ہیں لیکن کیا ہم سب سے بڑھ کر عدم تحفظ کے شکار نہیں —" میں پوچھتا ہوں۔

"ہندوستانی قوم بہت بری طرح عدم تحفظ کی سوچ کا شکار ہے۔ تم کرائے کے مکان میں کیوں رہتے ہو — لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ لیکن میں کرائے کی دنیا میں رہتا ہوں میں جواب دیتا ہوں۔ ہندوستانی لوگوں کا روحانیات سے کوئی تعلق نہیں روئے زمین پر ان سے زیادہ مادہ پرست اور کوئی نہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں حتیٰ کہ سنسکرت میں بھی روحانیات کے لیے کوئی لفظ نہیں — کیا تمہیں پتہ ہے — ہم نے ایک لفظ "ادھیاتمک" گھڑ لیا لیکن وہ بھی انگریزوں کے آنے پر —

وجہ صاف ظاہر ہے — ہندوستان صدیوں تک افراتفری اور بدامنی کا شکار رہا ہے اگر کبھی تھوڑی دیر کے لیے امن کا دور آیا بھی تو لوگوں نے یہی سوچا کہ کسی نہ کسی طریقے

سے حل بنایا جائے معلوم نہیں یہ اچھا دور کب تک ہے — ایک اور وجہ بھی ہے — قوت کی کمی — جن لوگوں کے پاس زیادہ قوت نہیں انہیں اپنے تحفظ کی خاطر اٹھنا پڑتا ہے کیا کبھی کوئی شیر بھی اپنی غذا کے لیے فکر مند ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ جب چاہے شکار کر کے غذا حاصل کر سکتا ہے ایسا اعتماد کسی بھی ہندوستانی کے نصیب میں نہیں۔"

"اگر ہم اتنے ہی مادہ پرست ہیں تو پھر مغرب کے بعض لوگ بھارت میں کشش کیوں محسوس کرتے ہیں —" میں پوچھتا ہوں۔

"انیسویں صدی میں سب سے پہلے جرمنوں نے ہندوستان کو ایک روحانی قوم سمجھنے کی غلطی کی۔ یہی خیال مغرب کی دنیا میں چھایا ہوا ہے۔ مغربی اقوام اپنی اقدار کھو بیٹھی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے کچھ حاصل کر سکیں گی۔ جب وہ یہاں آتے ہیں تو حقیقت حال دیکھ کر حیران پریشان واپس چلے جاتے ہیں۔ ہمیشہ آپ کو بڑی سے اترے ہوئے لوگ سکون تلاش کرتے ہوئے نظر آئیں گے کچھ نشہ آور چیزوں کے لیے آتے ہیں اور کچھ جنسی آسودگی کی تلاش میں جو کہ ہندوستان میں وجود ہی نہیں رکھتی ہندوستان سیکس کے لحاظ سے دنیا کا گندترین ملک ہے۔"

"گویا ہمارے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں —"

"ہماری تہذیب کے پاس ضرور ہے لیکن ہمارے پاس نہیں۔ کتنے ہندوستانی اپنی تہذیب کے بارے میں جانتے ہیں۔ کتنے افراد اپنی زبان خود پڑھ اور جان سکتے ہیں میں اس ہندوستانی سے نفرت کرتا ہوں۔ جو ہندوستان کو انگریزی زبان کے ذریعے جانتا ہے —"

"ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے مثلاً جندرتی اور تو سی کے شنکراچاریہ جی —؟"

"اگر میں اندرا گاندھی کی جگہ پر ہوتا تو ان دونوں کو پھانسی پر چڑھا دیتا در حقیقت دو کاروباری لوگ ہیں ہندو سادھو قوت کے متلاشی ہیں۔ وہ بادشاہوں کی مانند ہیں وجیوں کی طرح غلبہ پانے کی مانند وہ ذہنوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے

مریدوں کی نجی زندگی پر بھی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کوئی مرید اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے اور سادھو سے صلاح لیتا ہے تو یہی سادھو اکثر اوقات بنے بنائے رشتے توڑ دیتے ہیں۔ صرف اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لیے ان میں سے تین چوتھائی تو اپنے مریدوں کی بیویوں پر بھی تصرف رکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں مرید اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ تم ہندو مذہب کی اخلاق سوزی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"کیا یہ اخلاق سوزی جنسی محرومی کا نتیجہ نہیں ہے؟"

"جنسی پابندی ہندوستان کا نیا شاخسانہ ہے۔ پرانے اصول میں ہندوستانی معاشرہ اس پابندی سے آزاد تھا عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں نئی اقدار منع رہا ہوں گی اعلیٰ ترین محبت کے پیچھے بھی لذت کا حصول پوشیدہ ہے بالکل ایسے ہی جیسے بہترین وائن میں زیادہ الکحل ہوتی ہے سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم پرانے دور کی طرف جا رہے ہیں جب ہم وائن پیتے ہیں تو الکحل نہیں پی رہے ہوتے۔ لیکن جو آدمی الکحل کا رسیا ہے وہ تیز ترین الکحل ہی پیے گا سیکس بھی ایسے ہی ہے جس آدمی کو قدرتی طریقے پر جنسی آسودگی میسر نہ ہوگی وہ کسی گھٹیا سے گھٹیا طوائف کے پاس جائے گا خواہ وہ آتشک کا مریض ہی کیوں نہ ہو۔"

"نوجوان ادیبوں کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟"

"جس موضوع پر آپ لکھنا چاہیں اسے تلاش کریں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ علم بہرحال محبت کا پھیلاؤ ہے پھر مکمل سنجیدگی اور خلوص سے لکھیں ثانوی درجے کی تحریر ہرگز نہ لکھیں۔ اپنے تجربات کا اظہار کریں۔"

"اگر انگریزی زبان میں لکھیں تو اس سے کوئی فرق پڑے گا۔"

"یقیناً۔ اگر انگریزی زبان میں لکھنا مقصود ہو تو یہ ہرگز نہ سوچیں کہ صرف ہندوستانیوں کے لیے لکھ رہے ہیں جتنی اچھی انگریزی ہوگی اتنی ہی بڑی مقبولیت ہوگی ایک اور چیز جب تک کوئی ہندوستانی یورپی غذا نہیں کھائے گا اچھی انگریزی نہیں لکھ سکے گا۔ ہندوستانی خوراک اعصاب کو متاثر کرتی ہے اور ذہانت کمزور ہو جاتی ہے ایسی

محسوس ہوتا ہوں لیکن نراد چودھری سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہے؟

"ہندوستانی طلباء کی بے چینی پر آپ کیا کہتے ہیں۔"

"ہندوستانی طالب علم بغاوت پر آمادہ ہے۔ وہ ہر اس قدر کا دشمن ہے جو اس کی بزرگ نسل اس پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ ہر باپ کی خواہش ہے کہ اس کی اولاد مکمل طور پر روایت پرستانہ زندگی گزارے۔ بغاوت تو کرتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنی کوئی مثبت اقدار نہیں ہیں ہمارے معاشرے میں نااہلیت کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی اور کسی اہل کو انعام نہیں ملتا۔ اہل لوگ نااہل لوگوں کے لیے انشورنس پریمیم مہیا کرتے ہیں۔"

وقت ختم ہونے والا ہے نراد چودھری نے صرف نصف گھنٹے کے لیے وقت دیا تھا لیکن ہماری بات چیت ختم ہوتے ہوتے تین گھنٹے بیت چکے ہیں۔ نراد چودھری ابھی سب کچھ کہہ سکتا ہے وائن نے مجھے تھوڑا سا مست کر دیا ہے فرانسیسی بیئر کا ذائقہ ابھی تک تازہ ہے حالانکہ ذہن دن سنز کی تحویل میں رہا ہے۔

دروازے پر وہ مجھے اپنے جاپانی سائل کے درخت اور پودے دکھاتا ہے ان میں کیکٹس بھی ہے نہایت خوبصورت بہت سی عمدہ مٹی اکھیر۔ وہ شفیق انداز میں کیکٹس پر جھکتا ہے۔ میں دونوں کی طرف باری باری دیکھتا ہوں۔ دونوں میں بے تحاشا مشابہت ہے

مُعجزہ ساز — داداجی

میرا کوئی مذہب نہیں ۔ مجھے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مذہب عقل سے انکار ہے اور عقل میرے لیے عظیم ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے خلاف نہیں ہوں جو مذہب سے پیوستہ ہیں کیونکہ مذہب ان میں سے کچھ کے مفاد میں بھی ہے میں معجزوں اور جادو پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن یہ مانتا ہوں کہ کچھ نظریات ایسے ہیں جو سائنس دانوں کو بھی ششدر کر دیتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ آمیہ رائے چودھری سے اپنی ملاقات کے ابتدائیے کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ آمیہ رائے چودھری جسے اس کے بہی خواہ "داداجی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مجھے داداجی کے بارے میں دو کتابیں ملیں۔ ان کتابوں میں مشہور و معروف ڈاکٹروں، پروفیسروں اور تاجروں کے خراج عقیدت تھے۔ یہ سب داداجی کی کرامات سے متاثر تھے اور بذات خود تجربہ کر چکے تھے۔ میرا تجسس بیدار ہوا کچھ روز بعد فلم سٹار ابھی بھٹہ چاریہ میرے دفتر آیا اور مجھے داداجی سے ملانے لے گیا۔ اس کے چہرے پر پھوٹتی خوشی کی لہروں نے مجھے شک میں ڈال دیا غالباً اس نے مجھے داداجی کے دھرم باسیوں (مریدوں) میں شمار کر لیا تھا

میں واقعات کے اظہار میں کسی تعصب کو بروئے کار نہیں لاتا۔ بہرحال میں داداجی کے کمرہ استقبالیہ میں دیوان کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا اور وہ دیوان بھی غالباً داداجی کے لیے تھا اس وقت۔ وہاں تقریباً آدھی درجن مرد اور عورتیں تھے سب کے سب بنگالی ـ داداجی اندر داخل ہوئے سب تعظیماً کھڑے ہو گئے ایک آدمی نے تو بڑھ کر اپنا سر داداجی کے پاؤں پر رکھ دیا۔

داداجی لمبے قد اور نازک جلد کے مالک ہیں۔ ان کے کالے گیسو دراز ہیں ان کی جوانوں والی خوبصورتی ان کی ستر سال کی عمر کو جھٹلا دیتی ہے۔ جو کوئی بھی ان کو دیکھتا ہے ان کی ہپناٹزم کے اثر والی آنکھوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے پدما گندھا (کنول کی خوشبو) سارے کمرے کو معطر کر دیتی ہے

داداجی دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں اور میری طرف متوجہ ہوئے ہیں میں اٹھتا ہوں اور ان کے قدموں کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ مجھے بڑے مہربان لیکن مسحور کرنے کے انداز میں گھورتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے آنے کا مقصد کیا ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ میں کسی مذہب کا ماننے والا نہیں کسی روحانی شے کا وجود تسلیم نہیں کرتا اور داداجی اور ان کے پیروکاروں کا تجسس مجھے وہاں کھینچ لایا ہے۔

"اگر مری سیتہ نارائن خود تم سے بات کرنا چاہیں تو ـ" وہ پوچھتے ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں پاتا۔ "اگر وہ تمہیں کوئی نشانی بھیجیں تو ـ؟" وہ پھر پوچھتے ہیں وہ اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہیں جو خالی ہے لیکن میرے سامنے ہی اس پر ایک کانسی کا تمغہ نمودار ہوتا ہے جس پہ ایک بزرگ کی شبیہ ہے۔ "یہ مری سیتہ نارائن کی طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے ـ" داداجی کہتے ہیں۔ "نہیں ایسا نہیں ہے ـ" میں احتجاج کرتا ہوں داداجی۔ "یہ آپ مجھے دے رہے ہیں ـ" وہ مسکراتے ہیں "میں کچھ بھی نہیں ـ یہ تمام کرامات مری سیتہ نارائن کی ہیں ـ"

"تمہارا نام کیا ہے" وہ پوچھتے ہیں میں بتاتا ہوں۔ وہ تمغہ واپس لیتے ہیں انگوٹھے سے اس کی ایک طرف مسلتے ہیں جو صرف خالی تھی اب اس پر ایک نام کھدا ہے صرف میرے نام کے ہجے درست ہیں صرف ایک لمحے کے بعد داداجی کی ہتھیلی پر ایک سونے کی زنجیر نظر آتی ہے۔ "اب یہ تمغہ تمہارے گلے میں پہنانے کے لیے ہے" وہ کہتے ہیں۔ اور مجھے تھما دیتے ہیں۔

"میرے ساتھ آؤ ـ" وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں لے جاتے ہیں ایک دفعہ پھر ہم مختلف سطحوں پر ہیں۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ جاتے ہیں اور میں فرش پر وہ مجھے

بتاتے ہیں کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں سری ستیہ نارائن تمام کائنات پر چھائے ہیں۔ گرو کوئی نہیں ہیں ہر آدمی اپنا گرو آپ ہے کیونکہ وہ سری ستہ نارائن کا حصہ ہے۔ یاد رکھنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ "تمہارا نام تمہارا ہے اور یہ کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے "تم اسے اپنی زبان میں معلوم کرنا چاہتے ہو—؟" وہ مجھے کاغذ کا ایک خالی پرزہ پکڑاتے ہیں اور سری ستیہ نارائن کی تصویر کے سامنے جھکنے کے لیے کہتے ہیں میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ کاغذ پر گورمکھی میں دو الفاظ ابھرتے ہیں گوپال گوبند — ایک لمحے کے بعد کاغذ پھر سفید ہے۔ ظاہری طور پر پیغام مل چکا ہے اور کاغذ پر تحریر کی ضرورت باقی نہیں۔ وہ میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس میں سے پدما گندھا کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ایک دہریئے کے لیے یہ ایک سود مند تجربہ ہے لیکن اس سے میرے مذہب کو نہ ماننے اور معجزوں پر عدم یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ ہی میری عقل خدا کے بارے میں اس قسم کی شعبدہ بازیوں کو تسلیم کرتی ہے۔ گرو اور تمہارا نام (اسم اعظم) ہماری وحدتی کے فلسفے میں شامل ہے — لیکن میں قاری کو اس کے ذہن کی رسائی پر چھوڑتا ہوں۔

موم بتی کی روشنی اور داتا بل

اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے میں اپنے ہمسایوں کے ہاں پتہ کرتا ہوں۔ ان کی بجلی بالکل ٹھیک ہے میں واپس آکر مختلف سوئچ آن آف کرتا ہوں شاید کوئی خرابی نظر آئے۔ کلِک کلاک، کلِک کلاک — بجلی ندارد۔

شاید فیوز اڑ گیا ہے۔ میں ہمیشہ سوئچ بکسوں سے خوفزدہ رہا ہوں اور سرکٹ شارٹ ہونے یا وائرنگ یا فیوز لگانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا میں صرف فون کر کے مدد کے لئے پکار سکتا ہوں۔ لیکن اس طرح تو گھنٹوں صرف ہو جائیں گے میں ایک چھوٹی سی دعا دہراتا ہوں بجلی کی روشنی کا دیوتا میری اس دعا کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں موم بتیوں کا وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو ہند و پاک جنگ کے دوران خریدا تھا۔ انہیں ایک خاص طریقے سے لگاتا ہوں اور جلاتا ہوں۔

کال بیل خاموش ہے اس لیے دروازے پر دستک ہوتی ہے شاید زیر کا مان گئے ہیں اور انہوں نے کسی کو مدد کے لیے بھیج دیا ہے — میں دروازہ کھولتا ہوں۔ واہ — حقیقتاً یہ ایک دیوتا سمان انسان ہے۔ کالے بالوں اور کالی داڑھی میں سے داتا بل کا زرد چہرہ پورے چاند کی طرح نمودار ہوتا ہے اس کا سیکرٹری اور ہمدست اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوتا ہے۔

میں اس کی تاریکی اور بجلی فیل ہونے کی وجہ سے کمرے کے اندر کی گھٹن پر معافی مانگتا ہوں — فکر کی کوئی بات نہیں — وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہتے ہیں حقیقتاً میں بجلی کی روشنی کی بجائے موم بتی کی روشنی زیادہ پسند کرتا ہوں — میرے ذہن میں بہت عجیب خیال آتا ہے کہ بجلی کا فیل ہونا داتا بل کی آمد سے تو نہیں — ؟

وہ پینتیس سال کا نوجوان آدمی ہے — دبلا پتلا۔ لیکن گفتگو کا انداز اور اس کی آنکھوں کی قوت ظاہر کرتی ہے کہ اس کے اندر کتنی توانائی موجود ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ سیشن جج کا بیٹا ہے اور لیڈز یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اپنا گریبان ٹھیک کرتا ہے اور کہتا ہے: "تم مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے —"

"ہاں پوچھنا تو بہت کچھ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں کئی بار کی سنی ہوئی باتیں ہی سن سکوں گا۔ بہتر ہے کہ آج بات چیت تمہارے بارے ہی میں ہو۔ تم اس راستے پر یعنی روحانیت کے راستے پر کیسے آئے —؟"

"روحانیت — سپر چوالزم۔ مجھے اس کا پہلا تجربہ تین سال کی عمر میں ہوا۔ میں نے اپنے اندر وسعت کی ایک عجیب حس بیدار ہوتے ہوئے دیکھی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو —"

"ہاں ہوں — وسعت سے کیا مراد —؟"

"وسعت سے مراد، پھیلنا ہے — بڑا ہونے کا احساس —" وہ وضاحت کرتا ہے — اپنے دونوں بازوں کو پھیلاتا ہے — بالکل اس طرح جس طرح سینہ بڑا کرنے کے لیے لوگ ورزش کرتے ہیں — "کیا اب بات سمجھ پائے ہو —؟"

"ہاں — تاہم تم بتاؤ ہوا کیا — تم نے کیا محسوس کیا —؟"

"میں نے دریافت کیا کہ میرے اندر واقعات کو پہلے سے دیکھ لینے کی صلاحیت موجود ہے — کیا سمجھے —؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا — "کیا سمجھے" یا "سمجھ گئے" ہو اس کا تکیہ کلام ہے اور گفتگو کے دوران وہ ان کا بے تحاشا استعمال کرتا ہے۔

"مجھے کوئی مثال دو —" میں مطالبہ کرتا ہوں۔

"ہاں تو سنو — جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے ایک رات خواب میں ایک سانپ دیکھا جو جنگل میں بند تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے رہائی پانے کی درخواست کر رہا ہو — اگلے روز جب میں کالج کی لیبارٹری میں گیا تو میں نے دیکھا،

ایک جار میں سانپ موجود تھا جو کوئی شخص تجربات کے لیے سائنس کے استاد کے لیے لایا تھا۔ میں نے اس شخص سے اس سانپ کو آزاد کرنے کے لیے کہا۔ وہ ایسا کرتے ہوئے بہت ہچکچا رہا تھا۔ مراٹھی میں ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زخمی سانپ زندہ چھوڑ کر آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جس نے اس شخص کو مجبور کیا اور اس نے سانپ کو آزاد کر دیا۔ اب تم بتاؤ تمہارا اس واقعے کے بارے میں کیا خیال ہے —؟"

"ہو سکتا ہے اتفاقاً ایسا ہوا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے واقعہ ہوا اور بعد میں خواب آیا جو یقیناً تم بھول چکے ہو —" میں نے کہا۔ داتا بل میرے اس نظریے پر ناخوش نظر آتا ہے — "پیش بینی سائنسی طریقے سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ ماضی حال مستقبل سب ایک جاری عمل کا نام ہے۔ اگر تم ماضی کے بارے میں جان سکتے ہو تو پھر مستقبل کے بارے میں بھی جان سکتے ہو۔" وہ آئن سٹائن کے الفاظ دہراتا ہے۔ وہ ڈوروشیف اور آسپنسکائی کے نظریات کا حوالہ دیتا ہے — "کیا سمجھے —!"

"نہیں میں اس طریقے سے سائنسی توجیح نہیں مانتا — سائنسی توجیحات صرف قیاس آرائی پر نہیں تھوپی جا سکتیں۔ بالکل آئن سٹائن سے چھلانگ لگا کر آسپنسکائی پر پہنچنا مناسب نہیں —"

"ڈوروشیف آسپنسکائی کی نسبت زیادہ قرین قیاس ہے لیکن پیش بینی کی ممکنات تو نوسٹراڈیمس کی پیش گوئیوں سے بھی ثابت ہوتی ہیں —"

"اور تمہارا اپنا بھرگو سامنت بھی تو —" داتا بل کا سیکرٹری ڈیسائی مداخلت کرتا ہے۔

"میرا خون کھول اٹھتا ہے — یہ نوسٹراڈیمس یہ بھرگو سامنت سب فضول ہے — اور اگر اسے ہی تم سائنسی طریقہ کہتے ہو تو پھر میرے لیے صرف ایک "ہالو کی — نہیں —" میں کہتا ہوں —

داتا بل موضوع تبدیل کر دیتا ہے — "کیا تم شیلی کو [illegible] رکھتے ہو —" پھر وہ میری طرف دیکھتا ہے کہ میں [illegible] بھی وہ میری مدد کرتا ہے — میں چیزوں کی ذاتی قوت مادی سے ایک قدم [illegible]

دوسری جگہ حرکت دے سکتا ہوں۔"

"مسمریزم کے ماہر بھی لوگوں کی حرکت پر قابو پاتے رہتے ہیں۔" میں جواب دیتا ہوں
"صرف انسانوں پر نہیں۔ میں بے جان چیزوں کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تم کوہاپور
آؤ تو میں اس کا مظاہرہ کر سکتا ہوں" داتابل کہتا ہے۔

"کوہاپور کیوں۔ یہاں کیوں نہیں۔" میں اعتراض کرتا ہوں۔ داتابل وضاحت کرتا ہے کہ ایسے واقعات کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اور کرامات کا اظہار کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ مکمل تین منٹ کے لیے اپنی سانس روک سکتا ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے میں بڑا لطف ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ اور اسے دیکھ کر مجھے کولن ولسن کا آؤٹ سائڈر یاد آجاتا ہے۔ سائنس، روحانیت اور فلسفے کا مجمع

"تب سادھو، سوامی یا ستیہ میں ہرگز نہیں ہوں۔" وہ کہتا ہے۔ "میرے لیے ایسا بننا مشکل نہیں۔ ایک وقت میں لاکھوں افراد میری بات سننے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ میں کوئی دیوتا نہیں بننا چاہتا۔ میری شناخت اگر روحانیت کے علمبردار کی حیثیت سے ہو تو یہی بہت ہے۔ میں محبت کی قوت کا سبق دیتا ہوں۔ میں خورد و نوش کے اصول وضع نہیں کرتا۔"

"لیکن تم تجرد کے قائل ہو اور جنسی تعلقات سے یکسر دستبردار ہونے پر یقین رکھتے ہو۔"

"ہاں ایسا ہے لیکن اس کی وضاحت میں پھر کسی موقع پر کروں گا۔"

یہ حال ہے کہ داتابل سے میری گفتگو اب کسی روز زیادہ طول پکڑے گی اور جیسا کہ ان طویل ملاقاتوں میں ہوتا ہے، ایک موضوع سے کئی اور موضوعات جنم لیتے ہیں۔ سیکس سے تجرد کی طرف۔

مرارجی ڈیسائی

اس وقت مرارجی ڈیسائی کی عمر اکیاسی برس ہے۔ شکستہ، تھکا ہوا اور کسی قدر منتشر ذہن کا مالک۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ مسلسل گفتگو اور سفر میں مصروف ہے میں اس سے بمبئی ایئرپورٹ پر ملا جب وہ کھوج سے واپس آیا تھا۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ میری طرف چلا آیا۔ وہ میرے ہفت روزہ پرچے کے بارے میں فکرمند تھا اور مجھے کئی کچھ باتیں بتانا چاہتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کیا کہ کیسے گاندھی کو بھارت کا اس سال کا مرد آہن لکھ کر میں نے اپنے پڑھنے والوں کو مایوس کیا ہے۔ میں نے احتجاج کیا اور وعدہ کیا کہ سے تمام خطوط دکھاؤں گا۔ میرا خیال نہیں کہ وہ مجھے انٹرویو کے لیے وقت دے۔ لیکن اس نے کہا ساڑھے پانچ بجے آجاؤ لیکن میرے انٹرویو میں بعد میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونا چاہیے۔"

مرارجی بھائی کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں لیکن میں اس کی وطن دوستی کا ہر حال میں قائل ہوں وہ آپ کو جھاڑ تو پلا سکتا ہے (جیسا کہ اس نے مجھے پلائی) لیکن اس کی نیت کبھی بری نہیں ہوتی اور اندرا گاندھی ہی کی مانند وہ وقت کا بے حد پابند ہے ٹھیک ساڑھے پانچ بجے دوسرے ملاقاتیوں کو باہر نکال دیا گیا اور مجھے اندر بلا لیا گیا اس وقت وہ اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا لگ رہا تھا گرم جوش اور دوستانہ۔ اس کی گفتگو انسانی شرافت پر مبنی ہوئی اور وہ کبھی الفاظ کو ضائع نہ کرتا۔

"۲۶ جون ۱۹۷۵ء کی شب جب آپ کی گرفتاری عمل میں آئی تو آپ نے کیا محسوس کیا۔"

ج: یہ میرے لئے اچانک نہیں تھا کم از کم دو سال سے اور زیادہ تر ۱۹۷۴ء سے مجھے اس کا احساس تھا کہ کوئی ایسا قدم اٹھنے والا ہے اسی لیے میں نے دو دفعہ بھوک ہڑتال کی تاکہ لوگوں کو بیدار کیا جا سکے۔ یہ قربانی ہی ہے جو لوگوں کو یاد رہتی ہے

س: ایمرجنسی کے دوران کتنے لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔

ج: کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ڈیڑھ لاکھ کچھ کے خیال میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار لیکن ایک لاکھ سے کم کسی صورت میں بھی نہیں۔

س: سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد صرف بارہ ہزار ہے۔؟

ج: یہ سفید جھوٹ ہے۔ صرف اٹھارہ ہزار افراد تو مدھیہ پردیش کی حکومت نے گرفتار کیے اور یہ بات ان کے گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔

س: گرفتاری کے دوران آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔؟

ج: میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ نہ ہی وہ بُرا سلوک کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

س: ریڈیو اور اخبار سے دُور تو رکھا جا سکتا تھا۔؟

ج: پہلے دو تین روز تو مجھے کوئی اخبار مہیا نہیں کیا گیا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اخبار یا ریڈیو میرے نزدیک خوراک سے زیادہ اہم ہیں اور اگر آئندہ دو روز میں یہ چیزیں مہیا نہ کی گئیں تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ دنیا میں یا ملک میں کیا ہو رہا ہے اس کی خبر کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے میں نے تحریری درخواست نہیں دی تھی بلکہ ایک افسر کو زبانی بتا دیا تھا اور پھر اگلے ہی روز مجھے اخبار مل گئے۔

س: انیس ماہ کی قید کے بعد آپ میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی کیوں؟

ج: میں بھگوان پر یقین رکھتا ہوں اس لیے میرے اندر تلخی پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں بھگوان اور اس کے اصولوں پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قانونِ فطرت کے برعکس کچھ ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ میری گرفتاری بھی یہاں تک کہ وزیر اعظم کا عہدہ بھی قانونِ فطرت کے خلاف برقرار نہیں رہ سکتا لیکن یہ تمام واقعات

اس تربیت سے ہوتے ہیں کہ نتیجتاً بہتر صورت سامنے آجاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ناتیفائڈ جیسی موذی بیماری آپ کی صحت بہتر بنا دیتی ہے کیونکہ آپ اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ اگر جدوجہد نہ کریں تو پھر موت یقینی ہے۔

اگر میری قید قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی تو مسز اندرا گاندھی مجھے جیل نہیں بھیج سکتی تھیں اگر آپ میں ایمان ہے تو آپ ہر چیز کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے ہیں کیا آپ یقین کریں گے کہ قید کے دوران میں بالکل صحیح و سالم رہا حالانکہ میں قید تنہائی میں تھا۔ اور سب کم لوگ قید تنہائی برداشت کر سکتے ہیں ایک شخص اکیلا رہ کر پاگل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھا۔ خدا ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔

س: کیا آپ اتنے اہم لیڈر تھے کہ آپ کو سب سے آخر میں رہا کیا گیا۔؟

ج: یقیناً میں آخری آدمی تھا جو رہا ہوا۔ اس لئے کہ میں نے کبھی موجودہ پابندیوں کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ اگر میں جیل سے نکل آتا اور الیکشن اناؤنس نہ ہوتے اور ایمرجنسی لگی رہتی تو میں خاموش نہ بیٹھتا۔ میں اس کے خلاف بیان دیتا اور ہم جیل میں ہوتا۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر میں اکیلا ہی احتجاج کرنے والا ہوتا تو بھی میں ضرور کرتا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے اس وقت رہا کیا جب انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا لیکن یہ میرا اپنا اندازہ ہے اور یہی درست وجہ بھی ہے۔

س: آپ کے خیال میں مسز گاندھی کی طرف سے انتخابات کا اس موقع پر اعلان کرنا کیا معنی رکھتا ہے یہ انتخابات ایک سال پہلے یا بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔

ج: مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسز گاندھی کو یہ محسوس ہو گیا ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی، ان کی اپنی پارٹی کے اندر اختلافات، مایوسی اور بد امنی دن بدن ان کے انتخاب جیتنے کے مواقع کم کر رہی ہے۔

جبری خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام سے بہت سے لوگ نالاں ہیں یقیناً وہ اس کے بارے میں سوچتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اب وہ اسے رضاکارانہ طور پر کروانے کے

احکامات دے چکی ہیں اور اس سلسلے میں طاقت کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت جبر کیا گیا تھا دہلی اور مظفر نگر میں کئی افراد کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا لیکن اس کا ذکر کبھی اخبار میں نہیں آیا۔

میں اس سے اس لئے واقف تھا کہ میری قید کے دوران بھی ایسا ہوا۔ لوگ بستیوں سے باہر گھسیٹے گئے اور ان کی نس بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک بستیں خالی پڑی رہیں۔ لوگ خوفزدہ تھے اور ان میں سفر نہیں کرتے ہیں اسی احتجاج اور غم و غصے کو دیکھتے ہوئے مسز گاندھی نے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کے بعد وہ منتخب ہونے کے سلسلے میں قطعی طور پر نا امید تھیں اگرچہ وہ یہی کہتی رہیں کہ وہ جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں اس لیے انتخابات کروا رہی ہیں۔

س: آپ کے خیال میں انتخاب سے پہلے زیادہ اہم مسائل کیا ہیں

ج: ہم نے انہیں اپنے منشور میں تفصیل سے لکھا ہے۔

س: آپ نے لکھا ہے جمہوریت بمقابلہ ڈکٹیٹر شپ

ج: نہیں میرا کہنا ہے جمہوریت بمقابلہ جمہوریت کا انقسان کیونکہ کسی نہ کسی بدترین شکل میں جمہوریت تو ضرور موجود ہے۔ اصل میں اسے نقصان بہت پہنچا ہے اور زیادہ نقصان چوری نس بندی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب کسی وقت بھی ڈکٹیٹر شپ کی توقع ہو سکتی ہے۔ آئین میں ایمرجنسی کی ترامیم کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور ایمرجنسی لگائے کے بغیر بھی جبر مسلط کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ خوف کا ہے ہمیں خوف کے تدارک کے لیے کام کرنا چاہیے اس خوف نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے مجھے ہر جگہ خوف نظر آیا ہے۔ ۱۸ جنوری کے بعد حالت ذرا بہتر نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایمرجنسی اٹھائی نہیں گئی لیکن اسے نرم کیا گیا ہے اور وزیر اعظم سے آزادانہ انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا ہے ہر کوئی لوگوں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کر سکے گا اس لیے اب لوگ کسی حد تک دہشت سے باہر آ چکے ہیں۔

اسی طرح پریس کی پابندیاں بھی نرم ہوئی ہیں۔ انتخابات کے اعلان کے بعد

سٹیٹسمین اور انڈین ایکسپریس نے ہمیں کافی کوریج دی ہے۔ یہ اخبار ایمرجنسی کے دوران بھی خود مختار تھے، لیکن ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا کی سرکولیشن خاصی متاثر ہوئی ہے اب یہ اخبار بھی حزب اختلاف کے نظریات کو جگہ دینے لگے ہیں۔ اس سے بھی ہمارا حوصلہ کچھ بلند ہوا ہے لیکن یہ تمام مسائل نہیں ہیں۔

آئین کی بحالی کے لیے بہت سی بنیادی باتیں اہم ہیں۔ ہمیں اس بات کی ضمانت دینا ہوگی کہ اس قسم کی ایمرجنسی دوبارہ نہیں مسلط کی جائے گی کوئی حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ پھر ہم حکومت کے ترقیاتی منصوبوں پر غور کریں گے کیا وہ گاندھی کے نظریات کے مطابق ہیں، یعنی گاؤں خوش حال ہیں۔ اور اگر گاؤں خوش حال ہیں تو شہر اپنے آپ خوش حال ہوں گے۔ آج شہروں میں تعفن ہے۔ اور گاؤں ٹوٹ رہے ہیں دیہاتوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔

ہم مغرب کی طرح صنعت کی ترقی نہیں چاہتے۔ بہت سی چیزیں مشترک ہو سکتی ہیں بڑی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں لیکن جہاں ان کی گنجائش نہیں وہاں چھوٹی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ دیہات کے لوگ پوری طرح روزگار حاصل کر سکیں ہم نے اپنے منشور میں اس سارے کام کے لئے دس سال کا عرصہ رکھا ہے۔

ایک اور بڑا مسئلہ بدعنوانی کا ہے۔ اس کے بارے میں کمیشن تشکیل دیئے جائیں گے۔ اب دیکھیں کہ لوک پال بل گذشتہ چھ سال سے التوا میں پڑا ہے اگر ہم اقتدار میں آ گئے تو سب سے پہلے اس بل کو منظور کروائیں گے اس بل کی دفعات سے وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم بھی مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ اگر کوئی شکایت موصول ہوئی تو اس کے احتساب سے کوئی بھی مبرا نہیں ہوگا صرف اور صرف اسی طریقے سے بدعنوانی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

س: یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس بات کا اعتماد ہے کہ انتخابات آزاد اور منصفانہ ہوں گے۔ اس اعتماد کا پس منظر؟

ج: میں مطمئن ہوں کیونکہ سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہم ایسی صورت حال سے نمٹنے کے

قابل ہیں اور میرے خیال میں ہمیں وزیر اعظم کے بیانات پر بد اعتمادی نہیں کرنی چاہیے مسز گاندھی نے کہا ہے کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے تو ہم اس وقت تک یقین کریں گے جب تک کہ اس کے برعکس ثابت نہ ہو۔

س: کیا آپ سماچار، دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج: پہلے تو ایسا نہیں تھا لیکن اب انہوں نے حزب اختلاف کو کوریج دینی شروع کی ہے لیکن پھر بھی وہ حکومت کی خبریں زیادہ نشر کرتے ہیں۔ وہ جانبدار ہیں اور جہاں تک سماچار کا تعلق ہے تو وہ تو ایک آزاد نیوز ایجنسی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے درمیان صاف ستھرا مقابلہ ہے اور خود مختار ہیں۔ آئی اے ایس کا ایک فرد سماچار کا مینجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا ہے ان حالات میں سماچار کو آزاد ایجنسی کیسے کہا جا سکتا ہے اسی بات پر ذہن منتشر رہتا ہے۔ اس سے حکومت یا حکمران پارٹی کی نیک نیتی کمزور ثابت ہوتی ہے

س: کمپنی کے عطیات پر پابندی کے بارے میں آپ کا رد عمل کیا ہے؟

ج: اس سے عطیات نہ دینے کے بل پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اگر آپ سو بھی گیا تو ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

س: لیکن بہت سی کمپنیوں کو آپ سے ہمدردی ہے۔

ج: وہ تو ہے لیکن اگر وہ ہمیں کوئی عطیہ دیں گی بھی تو وہ خود تباہ ہو جائیں گی اب بھی بہت سے کانگریس کے ممبر (پولیس، افسرانِ اعلیٰ ایم پی اے یا ایم این اے کے علاوہ) لوگوں کو دھمکا رہے ہیں کہ ۲۲ مارچ کے بعد وہ ان سے نمٹ لیں گے میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں دہلی میں ایک پرنٹنگ پریس ہے۔ اس کے مالکان ہمارے ہمدردوں میں تھے ان میں سے ایک نے مجھے فون پر بتایا کہ انہیں اپوزیشن کی مدد کرنے سے روک دیا گیا ہے انہیں بتایا گیا کہ MISA ابھی ہٹائی نہیں گئی، ایمرجنسی ابھی برقرار ہے اور تمہارے ساتھ بعد میں نمٹا جائے گا۔ مالکوں نے پوچھا کہ وہ اب کیا کریں تو میں نے کہا کہ اگر وہ خوف زدہ ہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی نصیحت کر سکتا تھا کہ اگر وہ ہماری مدد کرنے سے خوف زدہ ہیں تو پھر کسی کی بھی

مدد نہ کریں لیکن اگر ہم تمہیں کوئی چیز شائع کرنے کے لیے دیں تو وہ ضرور شائع کرو اور ایسا بھی نہ کر سکو تو اللہ حافظ۔

انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا ہے اور اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں لوگوں کو ڈرانا نہیں چاہتا بلکہ میں ان کے اندر موجود خوف ختم کرنا چاہتا ہوں۔

س: بابو جگ جیون رام کے استعفیٰ کا کیا رد عمل تھا۔ انہوں نے پہلے ہی استعفیٰ کیوں نہ دیا؟

ج: جگ جیون رام نے پہلے ہی مستعفی نہ ہونے کی وجہ بتائی تھی اگر وہ پہلے ہی ایسا کر لیتا تو جیل میں ہوتا اور انتخابات نہ ہوتے۔

س: کیا آپ اس وضاحت سے مطمئن ہیں۔

ج: مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں نے اسے نکلنے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا کانگریس چھوڑ دینے کا فیصلہ پہلے ہی سے معلوم تھا۔

س: چون صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

س: آپ کا کیا خیال ہے وہ کانگریس چھوڑ دے گا۔

ج: میرا خیال ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔

س: جگ جیون کا کابینہ اور کانگریس چھوڑنے کا کیا اثر مرتب ہوگا؟

ج: جگ جیون بابو کا کانگریس چھوڑنے کا فیصلہ ہر سچھوتوں اور نیچی جات کے دوسرے لوگوں پر بڑا اثر ہوگا کیونکہ اس ملک میں قربانی یا تیاگ کی بڑی قدر ہے اور ایسا عمل اپنا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔

س: کانگریس، جمہوریت کی خاطر جنتا پارٹی میں کیوں شامل نہیں ہوتی۔

ج: نظریاتی اختلافات تو کوئی نہیں ہیں وہ بھی گاندھی جی کے نظریات کے دعویدار ہیں لیکن دوسرے اختلافات بھی ایسے نہیں کہ ہم لڑنے بیٹھ جائیں بنیادی اختلافات تو

مرکز نہیں طریقہ کار کے بارے میں الگ نظریات ہیں جن پر غور کیا جا سکتا ہے

س: مسز گاندھی کا خیال ہے کہ جنتا پارٹی، پارٹیوں کی جُوں جُوں کا مربّہ ہے اور ان میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ نہ ہی ان کا کوئی پروگرام ہے ۔؟

ج: وزیر اعظم ایسا کہہ سکتی ہیں۔ آپ نے ہمارا منشور دیکھا ہے۔ آخر لوگوں نے یونہی تو ہمارے پروگرام پر صاد نہیں کیا۔ ہم کمیونزم کے خلاف ہیں، ملک تقسیم کرنے کے خلاف ہیں اور عدم تشدد کے حامی ہیں اور گاندھی جی کے نظریات پر عمل پیرا ہیں

س: کمیونسٹوں سے آپ کی "الرجی" معلوم ہوتے ہوئے حیرانی کی بات ہے کہ CPM آپ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہے ۔؟

ج: تم کہتے ہو کہ مجھے کمیونزم سے الرجی ہے ۔ مجھے کسی سے بھی کوئی الرجی نہیں۔ مسٹر خشونت سنگھ تم مجھ سے الرجک ہو سکتے ہو کیونکہ میں شراب نوشی نہیں کرتا ہوں تم سے یا دیگر پینے والوں سے الرجک نہیں ہوں۔ میں تو صرف اتنا کہتا ہوں کہ جس طرح بیرونی نظریات معاشرے کے لیے نقصان دہ ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی نقصان دہ ہیں اور انہیں ایسے کاموں سے روکنا چاہیئے بصورت دیگر قوانین تعزیرات ہند بیکار ہو جائیں گی

تاہم جنتا پارٹی کے اتحاد پر گفتگو کی طرف لوٹتے ہوئے میں یہ سوچتا ہوں کہ کوئی سہ رکنی مقابلہ نہیں۔ اس طرح تو منتخب ہونے والی حکومت اقلیت کی حکومت بنے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے ۔

س: DMK کے ساتھ آپ کا اتحاد بھی انہیں بنیادوں پر ہے۔ DMK تو اپنی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے ۔

ج: نہیں وہ اس بات سے انکار کر چکے ہیں جب تک انہوں نے واضح الفاظ میں یہ اعلان نہیں کیا تھا وزیر اعظم ان کی ساتھی تھیں اب چونکہ انہوں نے اعلان کر دیا ہے اس لیے مجھے ان پر اعتماد ہے بصورت دیگر ہمارا ان سے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا اگر CPM بھی جمہوریت کی حمایت نہ کرتی تو ان سے ساتھ بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ لیکن یہ صرف انتخابی اتحاد ہے اور بس ۔

س: اس کا مطلب ہے کہ یہ اتحاد صرف مسز گاندھی کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے ہے ۔؟

ج: ہرگز نہیں۔ ہم برسر اقتدار پارٹی کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ اندرا کو نہیں ہمیں مسز گاندھی سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں لیکن چونکہ وزیر اعظم پارٹی کا کرتا دھرتا ہوتا ہے اس لیے حزب اختلاف اسی کی بات کرتی ہے اور یہ سب پر عیاں ہے ۔

س: س۔ کے پاٹل کے اس بیان پر آپ کیا کہیں گے جس میں اس نے کہا ہے کہ آپ کی جماعت میں اندرونی انتشار ہے اور اس کے ساتھ اور اس کی جماعت BPCC کے ساتھ غلط رویہ رکھا گیا ہے ۔

ج: کسی قسم کا کوئی انتشار نہیں۔ آراء کا اختلاف تو ایک فطری بات ہے۔ کیا ایسا اختلاف حکمران جماعت میں نہیں ؟ امیدواروں کے چناؤ میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی حلقے میں دس موزوں افراد ہیں تو آپ کس کس کا اطمینان کریں گے۔ بالآخر وہ کمیٹی ہی فیصلہ کر سکتی ہے جو اس مقصد کے لیے تشکیل دی گئی ہے ہو سکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے حقیقی اختلافات ہو جائیں۔ لیکن اگر کسی کے دل میں وطن کی حقیقی محبت ہے تو پھر اسے خود غرضی چھوڑنی چاہیئے۔ اسے جماعت کی ... کرنا چاہیئے اور اسے ... نہیں بنانا چاہیئے۔

دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ ایس کے پاٹل نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کی اس نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا ہے۔ اور پارٹی کی مدد کی ہے۔ اس نے ہر ایک سے درخواست کی ہے کہ پارٹی کو مضبوط بنایا جائے "تاکہ موجودہ حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے" مجھے اس کے اور کسی بیان کا علم نہیں۔

س: اس نے انتشار کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔

ج: اس کی اپنی پارٹی یا ذات کے خلاف انتشار ہو تو ہو اور تو کہیں انتشار نظر نہیں آتا ہم نے شامل جماعتوں کو سیٹوں کی الاٹمنٹ تو نہیں کی اس لیے یہ درست نہیں کہ BPCC کوئی قرارداد پاس کرے وہ منتخب ہونے والے امیدواروں کا فیصلہ

نہیں کر سکتے۔ یہ بات تو کمیٹی پر منحصر ہے کہ وہ کسے مقرر کرتی ہے اور مسٹر پٹیل اس کمیٹی کا رکن تھا اب اگر وہ اس کمیٹی کو مطمئن نہیں کر سکا تو پھر بیان بازی کیا معنی رکھتی ہے کمیٹیوں پر بہرحال اعتماد کرنا ضروری ہوتا ہے ہم ایک شخصی جماعت تو نہیں ہیں چیئرمین کا یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کو باہر نکال دے اختلاف رائے کی صورت میں سنٹرل کمیٹی بااختیار ادارہ ہے چیئرمین نہیں۔ ہم ایسے فرد کی خواہش نہیں رکھتے جس کی آواز تنہا ہو بلکہ ہم اجتماعی آواز کے حامی ہیں۔ لیکن کسی ایک آدمی کا نقطہ نظر کمیٹی کے لیے یا سب کو اکٹھا رکھنے کے لیے سود مند بھی ہو سکتا ہے۔

س:۔ مختلف ریاستوں میں آپ کی جماعت کی کامیابی کے کیا مواقع ہیں

ج:۔ ہر ریاست کے بارے میں حتمی طور پر کہنا تو مشکل ہے لیکن ہر ریاست میں نظر آنے والا جوش و جذبہ بڑا اچھا ہے میں نے ایسا جذبہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ جدوجہد آزادی کی تحریک میں بھی نہیں۔ لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے محض تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں۔ لوگ بڑے منظم ہیں۔ اور بڑے دھیان سے اور غور سے بات سنتے ہیں جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم عام اکثریت سے کامیاب ہوں گے۔

س:۔ مسز گاندھی کا خیال ہے کہ آپ کی پارٹی کی حکومت مستحکم نہیں ہو گی۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

ج:۔ کیا یہ درست ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ہم واضح اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا وہ اکثریت حاصل کر لیں۔ میں ممکنات سے انکار نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر مسز گاندھی مستحکم حکومت بنا سکتی ہیں تو ہم بھی بنا سکتے ہیں اور کیا ان کی حکومت مستحکم ہے؟ ذرا دیکھئے کہ ان کی اپنی جماعت کے اندر کیا ہو رہا ہے لوگ پارٹی کیوں چھوڑ رہے ہیں اور صورت حال اتنی اطمینان بخش کیوں نہیں۔ ان کی پارٹی تو دوسری پارٹیوں کا مجموعہ نہیں۔ کیا کانگریس دوسری کسی بھی پارٹی سے زیادہ چوں چوں کا مربہ نہیں۔

ہم کوئی گئی گذری جماعت نہیں۔ اگر ہم میں کوئی اختلافات تھے بھی تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں ختم سمجھیں اور گاندھی جی کے راستے پر چلیں اور جونہی انتخابات ہو جائیں گے ہم فروعی اختلافات ختم کر کے ایک پارٹی بھی بن جائیں گے۔ ہم نے اس کا اعلان کر دیا ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کتنی جلدی ایسا کرنا ممکن ہے۔

س:۔ آپ نے کہا تھا کہ اندرا گاندھی ہی صرف پارٹی ہیں۔ انہوں نے اپوزیشن نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک جماعت ہیں۔ آپ کا کیا تبصرہ ہے۔

ج:۔ ہم انہیں اندرا ہاتھ نہیں کہتے۔ یہ مرحوم کامراج کا بیان تھا جن کے ساتھ انہوں نے گٹھ جوڑ کرنا چاہا تھا۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ حکمران جماعت کو بتائیں گے۔ یہ تو مسٹر بروہا کا بیان ہے کہ مسز گاندھی بھارت ہیں" ہمیں الزام مت دیں یہ تو وہ خود یا ان کی جماعت ہے جو انہیں بھارت کی پہچان ثابت کر رہی ہے۔ ہمیں اندرا گاندھی کی حیثیت سے ان کے ساتھ کوئی اختلاف ہیں ہاں وزیراعظم کی حیثیت سے ضرور ہے۔

س:۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ مسز گاندھی کانگریس کو کمیونسٹوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ج:۔ میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن کچھ ریاستوں میں اب بھی کمیونسٹ کانگریس کے ساتھ ہیں۔

س:۔ گویا جس طرح آپ کے اتحاد میں دوسری پارٹیاں ہیں۔

ج:۔ ان کا CPI یعنی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ تو پکا معاہدہ ہے۔ صرف انتخابی رشتہ نہیں مثلاً وہ کیرولا میں کیا کر رہے ہیں۔ کیا وہ مل کر انتخاب نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم CPM کے ساتھ اس طرح انتخاب نہیں لڑ رہے۔ ہم صرف ان کے لیے سیٹیں چھوڑ رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے۔ ہم ایک دوسرے کی خاطر کام نہیں کر رہے ہیں جتنا پارٹی اکثریت حاصل کر کے حکومت بنا لیتی ہے تو CPM اس کا حصہ نہیں ہو گی۔

س: کیا یہ درست ہے کہ سنجے گاندھی حکومت کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں اور کانگریس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

ج: مجھے بتایا گیا تھا اور میں نے اخباروں میں بھی پڑھا ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے پولیس کا بڑا انتظام ہوتا ہے اس کے پاس بڑی بڑی کارپوریشنوں کی اجارہ داری ہے حتیٰ کہ جہاز تک خریدنے کے سلسلے میں وہ خود مختار ہے اور میرے خیال میں اس کا ذاتی طیارہ بھی ہے۔ اس سب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

سنجے گاندھی کا حق ہے کہ وہ انتخاب میں کھڑا ہو۔ وزیراعظم کا بیٹا ہونا اس کا یہ حق باطل نہیں کرتا لیکن کسی کو حکومتی مشینری استعمال کرنے کی اجازت نہیں خواہ وہ وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو۔ جب جنتا پارٹی برسر اقتدار آئے گی تو انگلستان، جرمنی اور دیگر ممالک کی طرح کسی سرکاری آدمی کو انتخابات کے لیے سرکاری مشینری استعمال نہیں کرنے دے گی۔

س: لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ بمبئی کے وزیراعلیٰ تھے تو آپ بھی بڑے خود مختار تھے ۔۔۔ کیا ایسا تھا ۔۔۔!

ج: کیا آپ کوئی ایسا واقعہ بیان کر سکتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ وزیراعلیٰ کی حیثیت سے میں نے ناجائز فائدہ حاصل کیا ہو۔

س: میں یہاں نہیں تھا۔

ج: تو پھر دوسروں سے پوچھیے کہ کوئی ایک مثال ہی پیش کریں۔

س: بمبئی میں پریس کانفرنس کے دوران آپ نے کہا تھا کہ آپ ٹائمز آف انڈیا کے خلاف ہو گئے تھے جب آپ وزیراعلیٰ تھے کیا یہ پریس کی آزادی کے خلاف بات نہیں اور کیا اس سے آپ کا خود مختار ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔

ج: میں نے اخبار کو اس کے نظریات کی سزا نہیں دے رہا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کی عمر سو سال سے زیادہ ہے اور ہندوستان میں اس کی بے انتہا عزت و توقیر ہے میرا ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں حالانکہ وہ ہماری بجائے دوسروں کا ساتھ دیتا ہے میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پریس مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے۔ اور حکومت اسے

مداخلت نہ کرے لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ حکومت زرد صحافت کی پشت پناہی نہ کرے

اس وقت ٹائمز آف انڈیا زرد صحافت کی طرف مائل تھا اور کئی دوسرے پرچوں مثلاً BLITZ کی مانند ذاتیات پر اتر آیا تھا اس لیے میں نے انہیں ذاتی حملے کرنے سے روکا تھا ان کے جنرل منیجر نے [illegible] سے شکایت کی لیکن پنڈت جی نے میری طرف داری کی اور کہا تم ایسا کیوں نہیں کہتے کہ اخبار کے نرخ زیادہ ہیں اس لیے تم نے اشتہار بند کر دیئے ہیں ۔۔۔ تو میں نے انہیں جواب دیا کہ میں ایسی جھوٹی بات نہیں کر سکتا جونہی وہ ذاتیات کی پالیسی چھوڑ دیں گے میں انہیں سرکاری اشتہارات دینا شروع کر دوں گا۔ اور پھر یہ اشتہارات ان کے مطالبے کے بغیر ہی انہیں دے دیئے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے کارکنوں میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے انہوں نے میری مدد چاہی تو میں نے ان کی مدد کی۔ کیونکہ میں اس ادارے کے خلاف نہیں تھا اس کے بعد مسٹر فرینک موریس میرے پاس آیا اس کا جنرل منیجر جے سی جین کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا میں مسٹر موریس کے حق میں تھا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پریس کے خلاف تھا میں آخری آدمی ہوں گا جو ایسا کروں گا۔

س: آپ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں رائج طریقوں کے خلاف ہیں اور رضاکارانہ طریقوں کے حق میں ہیں۔ کیا یہ حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔

ج: یہ غلط ہے کہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ہوں میں تو اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے حق میں ہوں بالکل گاندھی جی کی طرح لیکن ایسا کرنے والے لاکھوں میں دو تین ہی ہوں گے۔ اس لیے عوام الناس کی دوسرے طریقوں سے مدد کرنا چاہیے اور حکومت ایسا کر سکتی ہے لیکن یہ بالجبر نہیں ہونا چاہیے

آج کل لوگوں کی جبری نس بندی کی جا رہی ہے لوگوں کو بسوں سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور ان کی نس بندی کر دی جاتی ہے حتیٰ کہ بوڑھے لوگ بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں ایک ایسا شخص بھی اس ظلم کا شکار ہوا جس کی شادی کو ابھی صرف چند دن ہوئے تھے اُسے بھی بس سے اتار کر اس کی نس بندی کر دی گئی۔

س: یہ سب افواہیں ہیں ۔کیاان کی تصدیق ہوئی ہے ـــ؟

ج: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ افواہیں نہیں ہیں۔ لوگوں کو قتل کیا گیا ہے میرے پاس مثالیں موجود ہیں میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں لیکن میں اس کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ اس کی نوکری جانے کا خطرہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی ایک بچے کو جنم دینے والی ہے اس کے بعد وہ بیوی کی نس بندی کروائے گا لیکن اسے کہا گیا کہ اگر وہ خود ابھی نس بندی نہ کروائے گا تو اس کی تنخواہ بند کر دی جائے گی چھ ماہ تک اسے ایک پائی نہیں ملی بالآخر اسے نس بندی کروانا پڑی ایسی کئی مثالیں ہیں کہ پولیس نے لوگوں کو مارا پیٹا اور مجبور کیا، یہ کام ان طریقوں سے نہیں کیے جاتے.

اب حکومت کو احساس ہوا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب ہی انہوں نے منشور میں یہ کہا ہے کہ آئندہ کیا جائے گا میں مانتا ہوں کہ آبادی میں اضافے پر کنٹرول کرنا چاہیئے لیکن یہ مقصد اس وقت زیادہ بہتر طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جب لوگ خوشحال ہوں ۔کہ آپ دیکھیں گے کہ غریب لوگوں کے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور امیروں کے ہاں کم۔ جونہی لوگوں کے لیے اچھی ملازمت اچھا ماحول اور بہتر تعلیم مہیا کی جائے گی وہ خود بخود اس طرف مائل ہوں گے.

س: کیا جنتا پارٹی کامیابی کے بعد آپ کو وزیراعظم چن لے گی.

ج: میں کچھ نہیں کہہ سکتا یہ تو منتخب شدہ ممبران پر منحصر ہے.

س: لیکن آپ تو پارٹی لیڈر ہیں۔

ج: میں پارٹی کا چیئرمین بھی ہو سکتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں عوام پر اپنا اثر و رسوخ ڈالوں گا۔ اگر مجھ سے کہا جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن میں خود اس کے لئے جوڑ توڑ نہیں کروں گا میں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی اب میں اقتدار کی خاطر جنتا پارٹی میں نہیں آیا۔ میں نے زندگی بھر کبھی عہدوں کی خواہش نہیں کی یہ خود بخود میرے پاس چلے آتے ہیں

س: برسراقتدار آنے کے بعد کیا آپ ایمرجنسی کے دوران ہونے والے واقعات

کی تحقیق کروائیں گے یا بعض لوگوں کے خلاف الزامات کی تصدیق کروائیں گے؟

ج: بہت نمایاں چیزوں کی تحقیق و تفتیش ضرور ہوگی مثلاً بدعنوانی۔

س: کس کی ـــ؟

ج: مثلاً یونین منسٹر، مارچ میں ۱۲۵ ارکان پارلیمنٹ نے اس کے خلاف تحریری شکایت کی تھی لیکن یہ شکایت ایک طرف پھینک دی گئی اور ابھی تک اس پر کچھ نہیں ہوا DMK کو دیکھ لیں: تامل ناڈو کا پہلا گورنر DMK کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا، اچانک ہی وہ بدعنوان ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف ایک کمشن تشکیل دیا گیا ہے لیکن یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن نہیں بنایا گیا۔

اسی طرح جب تک کانگریس اکالیوں کے ساتھ تھی۔ ہر چیز ٹھیک تھی۔ لیکن جونہی انہوں نے ساتھ چھوڑا مرکزی حکومت نے ان کے خلاف ایک کمیشن مقرر کر دیا لیکن انہوں نے ابھی تک یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن مقرر کیا کیا یہ درست اقدام ہے۔

سنجے گاندھی

بے شمار سوالوں سے سلجے میں اس سے ملنے گیا۔ یہ انٹرویو کوئی خاص کامیاب نہیں رہا۔ اُس نے کئی سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ راز اُگلنے والی شخصیت ایک صحافی کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ لیکن خاموش اور کم گو شخص تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کی سوانح حیات لکھنے والا بھی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ جو انسان اپنے الفاظ میں وزن رکھتا ہے، اس شخص سے زیادہ متاثر کرتا ہے، جو ہوا میں باتیں کرتا ہے۔

وہ درمیانے قد، صاف رنگت اور چھریرے جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری، تیز اور ایمانداری کا تاثر لئے ہیں۔ ایک کمزور سی مسکراہٹ ہمیشہ اس کے لبوں پر ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ناراض ہے یا خوش۔ اُسے بات پسند آئی ہے یا بور ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ صاف لفظوں میں گفتگو کرتا ہے۔ شرمیلا پن لئے لیکن اپنے الفاظ کے استعمال میں بڑا محتاط۔ پیشانی سے پیچھے ہٹے ہوئے بالوں کے باوجود وہ ایک خوبصورت جوان ہے۔

سوال:۔ آپ نے سیاست میں دلچسپی لینا کب شروع کیا؟ میں نے پہلا سوال پوچھا۔

جواب:۔ یہ صحیح طور پر تو یاد نہیں، کہ کب۔ لیکن میں جس ماحول میں پروان چڑھا، اس میں سیاست میں حصہ نہ لینا ناممکن ہوتا۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کے دوران ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ اُس سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا، کہ اس کے باپ فیروز گاندھی، اس کے دادا جواہر لعل اور اس کے پردادا موتی لعل کی ارواح نزدیک ہی موجود ہیں۔ ساتھ کے کمرے سے ایک نسوانی آواز کبھی کبھار آجاتی تھی، اور میرا خیال ہے، کہ یہ آواز اس کی ماں مسز اندرا گاندھی کی آواز ہے۔ مجھے احساس ہوا،

دوسرا یہ بھی حماقت تھی کیونکہ سنجے گاندھی نے سیاست دودھ کی بوتل کے ساتھ ہی گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دی ہوگی۔ میں نے اپنے سوال کی شکل تبدیل کی۔

سوال:۔ میرا مطلب ہے، کہ آپ نے کب یہ محسوس کیا، کہ ہمارے ملک کے سیاستدان کیسے ہیں اُن کے درمیان کیا اختلافات ہیں، اور وہ کیا چاہتے ہیں؟

جواب:۔ اس نے بغیر کسی تلخی کے جواب دیا۔ میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ کافی عرصے سے انہوں نے عادتوں کی بنا پر مجھے نشانہ بنا رکھا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح باقی باتیں بھی مجھے معلوم ہوگئیں۔ اخبار اور لوگوں کی زبان۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ اگلوا سکا۔

سوال:۔ کیا آپ کو اپنے نانا یاد ہیں۔ کیونکہ جب ۱۹۶۳ میں وہ چل بسے تو آپ کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی؟

جواب:۔ اُس نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا، نانا ۱۹۶۳ میں نہیں۔ بلکہ ۱۹۶۴ میں فوت ہوئے تھے۔ اس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہیں۔

سوال:۔ کیا آپ اُن سے بے تکلف تھے؟

جواب:۔ بالکل ایسے ہی جیسے دوسرے لوگ اپنے نانا یا دادا سے ہوتے ہیں۔

سوال:۔ کیا وہ آپ کی سوچ پر کسی طریقے سے اثر انداز ہوئے؟

جواب:۔ میں کوئی خاص طریقہ تو نہیں بتا سکتا۔

سوال:۔ اور آپ کی اپنے باپ سے بے تکلفی؟

جواب:۔ بالکل ــــ ہر باپ اور بیٹے کی طرح۔

سوال:۔ کیا انہوں نے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گذارا ــــ تعلیم میں آپ کی مدد کی؟

جواب:۔ ہاں ــــ اسباق کے دوران وہ میری مدد کرتے رہے۔

سوال:۔ میرا خیال ہے، یہی سلسلہ آپ کے بھائی اور والدہ کا بھی ہے؟

جواب:۔ یقیناً ــــ جو رشتہ دوسرے لوگوں کا اپنے بھائیوں یا ماں سے ہوتا ہے، وہی میرا ہے۔

میں اس کی خاندانی زندگی میں نقب لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے موضوع تبدیل کر دیا۔

سوال:۔ کیا مذہبی طور پر آپ کی تعلیم ہوئی۔ آپ مذہب کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب:۔ میں باقاعدہ طور مذہبی شخص نہیں ہوں۔ لیکن میں مذہب کے خلاف نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر کسی کو کوئی مذہب ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہے۔

سوال:۔ کیا کسی خاص کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب:۔ میں کسی ایک کا نام نہیں لے سکتا۔

سوال:۔ شاعری، ناول، تاریخ، سوانح ۔ کس شعبے سے زیادہ آپ کو دلچسپی ہے؟

جواب:۔ کسی سے بھی نہیں ۔ وہ مسکرایا۔ میرے مطالعے کے میدان اور ہیں۔

سوال:۔ ٹیکنیکل یا انجینئرنگ وغیرہ کی کتب؟

جواب:۔ ہاں ۔ بالکل اسی طرح کی۔

سوال:۔ آپ فیکٹری میں کتنا وقت دیتے ہیں؟

جواب:۔ تقریباً ہر روز صبح ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک۔ اس نے کہا، اور ان افواہوں کی تردید کی، کہ اس کا بھائی راجیو فیکٹری کی نگہداشت کر رہا ہے۔ یا یہ کہ فیکٹری برلا فیملی کے پاس چلی گئی ہے۔ لیکن سیاسی اور سماجی کاموں میں اس کا زیادہ وقت گزر رہا ہے۔ اور اگر حالات بدستور رہے، تو سنجے گاندھی صنعتکار سے زیادہ سیاست کار کے طور پر ابھرے گا۔

سوال:۔ کیا آپ پارلیمنٹ میں شامل ہونے کی کوشش میں ہیں؟

جواب:۔ کیسے؟ وہ تھوڑا سا پریشان دکھائی دیا۔

سوال:۔ راجیہ سبھا کے ذریعے ۔ میں نے اندازہ لگایا۔

جواب:۔ ہرگز نہیں۔

سوال:۔ لوک سبھا؟

جواب:۔ وہ کیسے؟

سوال:۔ ضمنی انتخابات کے ذریعے۔

جواب:۔ ہرگز نہیں۔

سوال:۔ تو پھر عام انتخابات میں۔

اس نے محسوس کیا، کہ میں اسے سیاسی بیان دینے کی طرف مائل کر رہا ہوں۔ وہ مسکرایا اور خاموش رہا۔ میں نے کہا تھا، کہ اس کا انٹرویو لینا نہایت مشکل ہے۔ میں نے ایک بار پھر موضوع تبدیل کیا۔

سوال:۔ مانٹریال میں ہماری مایوس کن کارکردگی پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے، یا کہ آپ کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟

جواب:۔ مجھے کھیلوں میں دلچسپی ہے۔ سکول کے زمانے میں باکسنگ اور پیراکی کا شوقین تھا۔ مجھے ہاکی میں شکست کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ لیکن میرا خیال ہے، کہ اگر ہمارے یہاں سے کچھ پہلوان وہاں جاتے، تو شاید ایک دو تمغے لے آتے۔ میں نے پہلوانوں کو ملک سے باہر بھیجنے کی بات کی تھی۔ لیکن مجھے بتایا گیا، کہ وہ پہلے ہی ناکام ہو کر آ چکے ہیں۔ اس نے کندھے اچکائے اور مسکرانے لگا۔

سوال:۔ میرے خیال میں آپ سُرخ فیتے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آپ نے دہلی سے بلند شہر تک ایک ماہ میں سڑک بنوائی ہے؟

جواب:۔ میں نے نہیں، حکومت نے بنوائی ہے۔ اُس نے مداخلت کی۔

سوال:۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں تو ایسے منصوبوں کی کاغذی کاروائی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ سُنا ہے کہ آپ ایک بہت بڑی قوت کی مانند اس کے پیچھے تھے۔

جواب:۔ لوگ ایسا سوچتے ہوں گے۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے مایوس کیا۔ مگر میں نے حملہ جاری رکھا۔

سوال:۔ میں نے سُنا ہے، کہ سیر و سیاحت کی وزارت میں بہت سے کام التوا میں پڑے تھے۔ اور وہ آپ کی [illegible] کے باعث جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ کیا ایسا ہوا ہے۔ اور اگر ایسا ہوا ہے تو [illegible]

آپ باقی مسائل میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔

جواب:۔ بہت سی جگہوں پر کام ہو رہا ہے۔ دہلی میں پچھلے دو ماہ یعنی مئی اور جون میں دو، سے تین سو کلومیٹر سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔ تیس کالونیوں میں بھی سڑکیں بنی ہیں۔ جہاں وہ لوگ بسے ہوئے ہیں، جنہیں گندی بستی علاقوں سے نکالا گیا تھا۔ اب ان کالونیوں میں ساڑھے سات لاکھ کے قریب لوگ رہ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دہلی کے ترقیاتی ادارے نے کیا ہے۔

سوال:۔ لوگوں کا خیال ہے، کہ حکومت کے کاموں میں آپ کی مداخلت ہے۔ آپ اس الزام پر کیا کہیں گے؟

جواب:۔ ناراض ہونے کی بجائے اس نے آرام سے کہا۔ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں کسی جگہ بھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کر رہا۔

سوال:۔ ایسے ہی لوگوں کا کہنا ہے، کہ اس پراپیگنڈے کی وجہ سے آپ کے ان اچھے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ اور اب آپ نے دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے؟

جواب:۔ وہ ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ وہ مسکرایا۔ میں جو کام پہلے کر رہا تھا، وہی کر رہا ہوں، اور ایسی باتیں مجھے پریشان نہیں کرتیں۔

سوال:۔ آپ پارٹی میں کوئی عہدہ کیوں نہیں لے لیتے، تاکہ پارٹی کی کارکردگی بہتر ہو سکے؟

جواب:۔ میں پہلے ہی ایک پارٹی کا عہدے دار ہوں۔ میں یوتھ کانگریس کی نیشنل کونسل کا رکن ہوں۔

سوال:۔ پارٹی کی ایگزیکٹو میں کوئی اعلیٰ عہدہ کیوں نہیں؟

جواب:۔ میں اپنے کام میں مگن اور خوش ہوں۔ میں زیادہ بڑی ذمہ داری نہیں نبھا سکتا۔

سوال:۔ آپ نے حال ہی میں کہا تھا، کہ بزرگ لوگوں کو نوجوانوں کو راستہ دینا چاہیئے؟

جواب:۔ میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں نے کہا تھا کہ بزرگوں کو چاہیئے، کہ اگر نوجوان آگے آ رہے ہیں، [illegible] کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُن کے راستے میں کھڑے نہ ہوں۔

سوال:۔ حکومت میں، یا پارٹی میں؟

[illegible] میں کانگریس کے ریفرنس سے بات کر رہا تھا۔ کسی خاص شخص یا تنظیم کی بات نہیں تھی۔ [illegible] میں یہی چاہتا ہوں، کہ بوڑھی نسل نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرے۔ بدقسمتی سے اب نہیں ہو رہا۔ وہ نوجوانوں سے لاتعلق ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی لڑائی خود لڑ کر آگے آتا ہے تو بے شک آئے۔

سوال:۔ آپ کانگریس کی صدارت کے لئے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ یہ مضحکہ خیز ہے سوال میری دلچسپی کا بھی تو ہے۔

سوال:۔ کیا آپ کانگریس کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟ کیا اس کی تنظیم نو کی ضرورت نہیں۔

جواب:۔ کیوں نہیں، جیسا کہ میں نے بھٹنڈہ میں کہا تھا۔ کانگریس کو تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ آپ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی چلے جائیں، یوتھ کانگریس کو کانگریس کی نسبت زیادہ فعال پائیں گے۔ حالانکہ اس سے اُلٹ ہونا چاہیئے۔ کانگریس کو زیادہ فعال اور یوتھ کانگریس کو اس کے پیچھے ہونا چاہیئے۔

سوال:۔ آپ آگے آ کر اس کے لئے کچھ کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ یوتھ کانگریس کی ذمہ داری ہی میرے لئے بہت ہے۔

سوال:۔ کانگریس کی مشینری ایسا کیوں نہیں کر رہی؟

جواب:۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب کانگریس کے صدر سے معلوم کریں۔ میں یوتھ کانگریس میں ہوں۔ اور اس کے ارکان کانگریس سے مختلف ہیں۔

سوال:۔ مجموعی طور پر کانگریس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:۔ یہ کانگریس کے صدر کے سوچنے کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، کہ ہم انتہا پسند لوگوں کو یوتھ کانگریس میں نہیں آنے دیں گے۔ بہت سے انتہا پسند آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ممبر شپ لاکھوں لوگوں تک ہے۔ اس لئے ہم ہر آدمی کی تفتیش و تحقیق نہیں کر سکتے۔ جو کوئی رُکن بننا چاہتا ہے، بنتا ہے۔ لیکن ہمارے عہدے داروں میں کوئی انتہا پسند نہیں ہے۔

سوال: ۔ دُور دراز علاقوں مثلاً مہاراشٹر، تامل ناڈو اور بنگال میں یوتھ کانگریس کی پہنچ ہے؟

جواب: ۔ آہستہ آہستہ ہر جگہ پر رُکنیت ہو رہی ہے۔ مہاراشٹر میں تو اس کی حالت بہت اچھی ہے۔ بہت سے علاقوں میں یوتھ کانگریس کے اراکین نے پانی محفوظ کرنے کے لئے بند اور ٹینک بنائے ہیں، سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ تامل ناڈو میں یوتھ کانگریس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اس کے ابتدائی اثرات بہت اچھے ہیں۔ ابھی انتظار کریں گے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ بنگال میں صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ تمام علاقے میں سیاسی ماحول ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام سے زیادہ سیاست کا عمل دخل ہے۔ لیکن یوتھ کانگریس نے کچھ سماجی کام شروع کر رکھے ہیں۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ ہم اچھے کارکنوں کی جماعت ہیں۔

سوال: ۔ آپ کے ایک بیان کے مطابق جو کہ آپ نے "سورج" کو دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ پارٹی میں انتہا پسند بائیں بازو کا قبضہ ہے۔ جس کی لوگوں کو تشویش ہے۔ لیکن بعد میں آپ نے اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ۔ میں نے کسی چیز کے بارے میں اپنے نظریات میں تبدیلی نہیں کی۔

سوال: ۔ کیا آپ نے پارٹی کے لئے رقوم اکٹھی کرنے میں اصلاحات کی ہیں؟

جواب: ۔ میں نے کبھی اس کے بارے نہیں سوچا اور نہ ہی اب کرنے کی سوچ رہا ہوں۔

سوال: ۔ کانگریس میں بائیں بازو کے حامی اور کمیونسٹ اس بات سے نالاں ہیں، کہ آپ اپنی سیاسی سوچ کو کوئی لیبل نہیں دے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر سیاست میں کام نہیں ہو سکتا؟

جواب: ۔ یوتھ کانگریس بغیر کسی "ازم" کے اپنا کام بخیر و خوبی نبھا رہی ہے۔

سوال: ۔ قومیانے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ۔ کس چیز کو قومیانے میں؟ کیا قیمتوں میں اضافے کے لئے؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ کیا ہمارا مقصد ہر حالت میں کم قیمتیں نہیں ہونا چاہیے؟ اور اگر یہ ہے، تو پھر کوئی بھی طریقہ ہو، مقصد حاصل ہونا چاہیے۔ اگر قومیائے جانے سے ایسا ہو سکتا ہے، تو میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ جو [illegible]

کی حالت سدھارنے کے لئے جو بھی طریقہ اپنایا جائے، میں اس میں شامل ہوں۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

سوال: ۔ آئین میں مجوزہ ترامیم کے متعلق آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب: ۔ میں آئین کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔

سوال: ۔ کیا آپ کے خیال میں کسی تبدیلی سے پہلے ریفرنڈم ہونا چاہیے؟

جواب: ۔ میرے خیال میں ریفرنڈم کی ضرورت نہیں۔ ایک عام آدمی جو قوانین کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو، اس کی رائے اتنی اہم نہیں۔ میری مثال لیجئے۔ میں قانون کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ میں کوئی ذریعہ تجویز پیش کر سکتا ہوں، لیکن زیادہ گہرائی میں نہیں جا سکتا۔ یہ تو کسی ماہر کا کام ہے۔

سوال: ۔ کیا ایسی کمیٹی کی تشکیل ضروری نہیں، جو تمام پارٹیوں کی طرف سے تبدیلیوں کے بارے نمائندگی کرے؟

جواب: ۔ اگر پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت حق میں ہو، تو پھر فرق نہیں پڑتا کہ پارٹیاں زیادہ ہوں یا ایک ہی پارٹی کا فیصلہ ہو۔ ہر حالت میں اپوزیشن سے بات ضروری ہے۔

سوال: ۔ آئینی ماہرین سے رائے لینے میں کیا مضائقہ ہے؟

جواب: ۔ یہ تو اس پر منحصر ہے، کہ وہ آئینی ماہرین کون ہیں۔ ماہرین میں سے کچھ تو اتنے جانبدار ہیں، کہ ان کی رائے نہیں لی جا سکتی۔ اور اگر کوئی سچے ماہرین نکل بھی آئیں، تو ان کے پیروکاروں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تو پھر ان کی رائے یا مدد کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ یہی حال اپوزیشن کا ہے۔ تاہم ہر طبقے سے رائے لینی چاہیے۔

سوال: ۔ کیا آپ نے "السٹریٹڈ ویکلی" میں مس بھٹو کا مضمون پڑھا ہے؟

جواب: ۔ ہاں، میں نے سرسری نظر سے دیکھا تھا۔

سوال: ۔ صدارتی نظام حکومت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ نظام بہتر نہیں؟

جواب: ۔ ذاتی طور پر میں اس کے حق میں ہوں، کیونکہ یہ بھارت کے مفاد میں ہے۔ لیکن اگر آپ بالفرض فرانس کا نظام اپناتے ہیں، وہ پھر اسے ختم کر دیتے ہیں، یا التوا میں ڈال دیتے ہیں، یا

بندوق کی نالی پر رکھ دیتے ہیں، تو اس سے فائدہ؟ اس میں اپنے حالات کے مطابق ترمیم کی ضرورت ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں، کہ کیا کیا تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ یہ مضمون میرے علم سے باہر ہے۔

سوال:۔ کیا ہمارے لئے صدارتی نظامِ حکومت کی طرف گامزن ہونا ممکن ہے؟

جواب:۔ نہیں۔

سوال:۔ آپ حال ہی میں سوویت روس سے ہو کر آئے ہیں۔ آپ کا ردِ عمل؟

جواب:۔ ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوا ہے۔

سوال:۔ مختلف شعبوں میں ان کی ترقی کی کیا سطح ہے؟

جواب:۔ روس کے شہر بہت ترقی یافتہ ہیں۔ بعض شعبوں میں ان کی ترقی نمایاں ہیں، بعض میں کم۔ ہاؤسنگ اور ہیوی انڈسٹری میں زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ انہوں نے کئی بڑے شہر بھی بسائے ہیں۔ لیکن سڑکیں بنانے میں وہ کمزور واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس میدان میں ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ اگرچہ ان کا علاقہ ہم سے کہیں زیادہ ہے، لیکن وہ ہم سے کہیں پیچھے ہیں۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ یہ تو منصوبہ بندی کے مختلف نظریات کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے۔ بھارت ہم سڑکوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ کم۔ میں ذاتی طور پر سڑکوں کی تعمیر اہم سمجھتا ہوں۔ میں روس کے حالات کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس لئے مجھے اُن کے حالات کا علم نہیں۔ اُنہوں نے اپنے شہروں اور قصبوں میں فاصلے سڑکوں کی نسبت ہوائی رابطے سے کم کئے ہیں۔

سوال:۔ جس طرح آپ نے درخت بچاؤ سکیم شروع کی ہے۔ کیا اسی طرح شکار پر مکمل پابندی لگا کر آپ پرندوں کا تحفظ نہیں کر سکتے؟

جواب:۔ میں مکمل طور پر اس کے حق میں ہوں۔ لیکن لوگوں کے لئے اس میں مشکلات ہیں۔ یہ حکومت کا کام ہے۔ کیونکہ کانگرس ہی یہ کام کر سکتی ہے، جسمیں لوگ شامل ہوں۔

سوال:۔ آپ کون سے اخبارات کا مطالعہ پسند کرتے ہیں؟

جواب:۔ میں سب ہی اخبارات دیکھ لیتا ہوں، لیکن کسی خاص کے حق میں نہیں ہوں۔ میں رسائل پڑھنے کا زیادہ شوقین ہوں۔ بس کبھی نظر آجائیں، تو پڑھ لیتا ہوں۔

میں انٹرویو کے اختتام پر آپہنچا۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں آزادی سے اب تک ہماری سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟

جواب:۔ ہم نے زراعت اور صنعت کے میدان میں نہایت ہی مضبوط معاشی بنیاد تعمیر کر لی ہے۔ یہ بنیاد بہت سے دوسرے ترقی پذیر ممالک حتیٰ کہ چین سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے خشک سالی کا مقابلہ تو ترقی پذیر ممالک کی نسبت زیادہ اچھی طرح کیا ہے ـــــ خشک سالی کے دوران ہماری غذائی ضروریات صرف ایک یا دو فیصد کم تھیں۔ یورپی ممالک میں اب تک کیا ہو رہا ہے۔ اُن کی کمی دس فیصد تک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری بنیاد زیادہ مضبوط ہے۔ ہمیں صرف پاکستان کے ساتھ مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں چین سے بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چین کی آبادی تقریباً ہمارے برابر ہے۔ ان کا رقبہ ہمارے رقبے سے زیادہ ہے۔ اور ان کی آبادی ہم سے کم گنجان ہے۔ ہماری صنعتی بنیاد ان سے زیادہ وسیع ہے۔ چین نے سٹیل، ہیوی انڈسٹری اور دفاع میں زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ بشمول تعلیم وہ ہر شعبے میں ہم سے پیچھے ہیں۔ اگر کارخانوں اور مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے تو ہمارا پلّہ بہت بھاری ہے۔

سوال:۔ آپ کے ذہن میں اصل بھارت کیسا ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ میں چاہتا ہوں، کہ گاؤں ترقی کریں اور خود کفیل ہوں۔ ہریانہ اور پنجاب نے دیہاتوں میں سڑکوں کے جال بچھا دیئے ہیں۔ دیہاتی معاشیات کے لئے یہ ایک نہایت ہی منفعت بخش ترقی ہے۔ یوپی میں ابھی تک دیہات کا استحصال ہو رہا ہے۔ ابھی وہاں کسان کم قیمت پر فصل بیچتا ہے۔ اور خریدار منڈیوں میں لا کر زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ کسان کو مناسب قیمت میسر نہیں آتی۔ البتہ جنوبی بھارت کے دیہاتوں کے بارے مجھے علم نہیں۔ ہاں، اگر ہمارے جاری منصوبے پر عمل درآمد ہو جائے، تو ہمارے پچاس فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

سوال :- مہاراشٹر کے جبری نس بندی کے قانون کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب :- جبری نس بندی بہتر ہے، اگر اس کی پشت پناہی پر تمام مراعات ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہاراشٹر کے دیہاتوں میں یہ مراعات پہنچی ہیں کہ نہیں۔ ان کے بغیر جبر کی ضرورت نہیں۔

میں آخری سوال کی طرف آتا ہوں۔

سوال :- یہ خیال عام ہے کہ آپ پنجاب کے "داماد" ہونے کی بنا پر اس صوبے کے لئے جانبدار ہیں۔ اور اکثر یہاں آتے رہتے ہیں؟

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ جیسے پنجابیوں کے سامنے اس جانبداری کا اقرار کرے گا۔ مگر وہ مسکرایا

جواب :- ایسا ہرگز نہیں۔ یو پی، آندھرا، کرناٹک، ہماچل، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں ہر جگہ اتنی ہی بار گیا ہوں، جتنی بار پنجاب۔

یہ انٹرویو دورانوں میں دو گھنٹوں میں مکمل ہوا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے جاننے والوں سے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے معلوم کروں۔

سنجے گاندھی دہلی کے ولینگڈن ہسپتال میں چودہ دسمبر ۱۹۴۶ء کو صبح نو بج کر ستائیس منٹ پر پیدا ہوا۔ اس کا برج قوس ہے۔ جو فلم سٹار راجکپور کا ہے، جو ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوا۔ سنجے کے ہاروسکوپ کے مطابق وہ کھیل پسند، پرواز کرنے والا، بے تکلف مگر فلسفی ہو گا۔ ۱۹۷۶ء بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس وقت زبان زدِ خلق ہو گا۔ قانونی مسائل میں پھنسے گا اور بالآخر زمانے کو اپنے پیچھے لگالے گا۔

"سنجے" نام مہاتما منا سے لیا گیا۔ اس وقت وہ لوگ اپنے نانا جواہر لعل نہرو کے ہاں، وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ہما پارک روڈ پر رہتے تھے۔ جب سنجے دو سال کا ہوا، تو گاندھی جیم ز نی محمت مسز وجے لکشمی پنڈت نے بطور آفیسر استقبالیہ گھر کا چارج لیا۔ وہ اس خاندان کے ساتھ ۱۹۶۴ء تک رہی۔ آج کل وہ وزارت امور خارجہ میں ڈائریکٹر ہے۔

میں نے چاندنی تھرا سے درخواست کی کہ وہ ملا سے سنجے کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے

...ت کرواتے۔ وملا کا کہنا ہے کہ سنجے مشینوں اور چیزوں کی مرمت میں بڑی دلچسپی لیتا۔ ...نے اپنے کمرے میں ایک ورکشاپ بنا رکھی تھی، اور ہر وقت تجربات میں مگن رہتا تھا۔ ہم اکثر ...تیں انہیں اسے مرمت کرنے کے لئے دے دیتے۔ اور وہ اس کمال سے DURAFIX لگاتا کہ وہ ...معلوم ہوتیں۔ اس نے یہ تکنیکی رجحان اپنے والد فیروز گاندھی سے ورثے میں لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی مدد کی۔

سنجے گاندھی ایک شریر اور شوخ لڑکا تھا۔ وملا کہتی ہے کہ ایک دفعہ کشمیر میں وہ اپنی کسی سہیلی کے لئے سویٹر بن رہی تھی۔ سویٹر تکمیل کے آخری مرحلے پر تھا۔ ایک روز دوپہر میں کچھ دیر سونے کے بعد میں اٹھی تو سویٹر ندارد۔ مسز گاندھی سے معلوم ہوا کہ سنجے اور راجیو نے سویٹر ادھیڑ دیا تھا، اور بام کے درختوں کے گرد سارا اون لپیٹ دیا تھا۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اون آخر کتنا چل جاتا ہے۔ وملا کہتی ہے کہ

ہولی کا تہوار نہرو خاندان میں بہت مقبول تھا۔ ان کے موقعہ پر سنجے نے مجھ سے کہا تھا کہ میں باہر سے کمرے میں آکر کوئی چیز دیکھوں تو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ میں سمجھ کر میں کچھ سمجھ پاتی، کہ کیا ہونے والا ہے، سنجے نے مجھے دھکا دے دیا اور دونوں لڑکوں نے میرے اوپر رنگ پھینکنے شروع کر دیئے۔

ان شرارتوں کے باوجود سنجے میں ایک نوجوان مرد کی طرح احساس ذمہ داری بھی تھی۔ ایک دفعہ ہم لکھنؤ میں تھے۔ تو مسز گاندھی نے حکم دیا کہ نوکروں کو الہ آباد بھیجو۔ میں ان کے ساتھ سفر کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ "وملا تم کیوں فکر مند ہو؟" سنجے نے پوچھا۔ "میں ٹکٹ خریدوں گا۔ اور بھائی (راجیو) سامان گاڑی تک لے جائے گا۔" سارا کام دونوں نے کیا اور میں آرام سے بیٹھی رہی۔ ہم ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ کیونکہ مسز گاندھی چاہتی تھیں کہ بچوں کا مزاج خراب نہ ہو۔

راجیو اور سنجے سخت ڈسپلن کے تحت پروان چڑھے۔ وہ کبھی پارٹیوں میں شامل نہیں ہوتے تھے، تو وہ گھر میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دونوں لڑکوں کو کھانا پکانے کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کی والدہ انہیں DO-IT-YOURSELF قسم کی کتابیں لا کر دیتی تھیں۔ جب سارا خاندان وزیر اعظم کی رہائش گاہ تین مورتی ہاؤس میں منتقل ہو گیا، تو سٹاف کو کھانا کھلایا جاتا، تاکہ وہ دیکھیں ...

نے آج کیسا پکایا ہے؟ دونوں بھائی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔

سنجے وقت کا بے حد پابند تھا۔ اگر کار اسے سکول سے لینے پہنچنے میں تاخیر کر دیتی تو وہ بات میں [illegible] دیتا۔ اور ہر ایک سے پوچھتا پھرتا حتیٰ کہ دیر کا سبب معلوم کر لیتا۔

چاندنی چوک کے جیوں لعل گاندھی جو [illegible] انہیں [illegible] بھی ملی۔ [illegible] اس زمانے میں سرزمین روڈ پر بچوں کے سکول "شو کیس" کی انچارج تھیں [illegible] دس سال [illegible] گزارے [illegible] بہتر [illegible] لیکن اس میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ ایسی خود اعتمادی جن کے لئے شہرت کی ضرورت ہیں

ان کے ہمزاد کے مطابق سنجے کو انسانوں سے زیادہ جانوروں سے زیادہ پیار تھا۔ وہ رحمدل تھا۔ مسز [illegible] کا اس بات سے اختلاف کرتی ہیں کہ دونوں بھائیوں میں کوئی خاص قربت تھی۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ راجیو عام طور پر کھیل میں [illegible] رہتا تھا۔

وزیر اعظم کے خصوصی ایلچی اور نہرو خاندان کے دوست محمد یونس کے بیٹے عادل شہریار کا کہنا ہے کہ سنجے کو کاروں کے ساتھ انتہائی لگن تھی۔ وہ کار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس نے اپنی کھلونا کار کو کھول کر اس میں بیٹری فٹ کر دی تھی۔

۱۹۶۳ میں وہ کہیں سے ایک بنارسی کار لے آیا۔ وہ جامع مسجد کے قریب بازاروں سے اس کے سپیئر پارٹس ڈھونڈتا پھرا۔ اس نے اس کار کو ٹھیک کر لیا۔ اور ہم اس پر شہر کی سیر کو جاتے رہے۔

سنجے خطرات میں کودنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک جیپ اس کے ہاتھ آئی۔ تو اس نے ہل چلے کھیتوں اور سنگلاخ پہاڑوں کی سرزمین پر دوڑائی۔ اس کا کمرہ ورکشاپ تھا۔ چیزیں توڑنے میں ہم دونوں (عادل شہریار) ایک ہی ذہن کے مالک تھے۔ ایک دفعہ اس نے بجلی کا پنکھا بنانے کی کوشش بھی کی۔

عادل کے مطابق سنجے صرف اس کام میں دلچسپی لیتا، جس میں مسائل سے نمٹنے کی گنجائش زیادہ ہوتی۔ جونہی وہ مسائل سے عہدہ برآ ہو جاتا، تو سارا کام کسی اور کو دے دیتا، تاکہ تکمیل [illegible]

[illegible] دوست [illegible] ان کے مقابلے میں کند ذہن تھے۔ وہ بہت ذہین اور خود کفیل شخص تھا۔ کہ لوگ اس کی صاف گوئی سے [illegible] ناپسند کرتے تھے۔ لیکن وہ مغرور نہیں تھا۔ اگرچہ وہ آسائشات میں پروان چڑھا، مگر وہ گاندھی جی کی طرح سادگی پسند تھا۔ عادل شہریار کے خیال میں گھر میں کوئی خاص ڈسپلن نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو سنجے کے لئے بہر حال نہیں۔ ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا۔ صرف راجیو اسے ڈانٹ سکتا تھا۔ اور وہ اکثر اوقات ایسا کرتا رہتا تھا۔

سنجے نفیس خوراک کا شائق نہیں تھا۔ وہ مضحکہ خیز حد تک انڈوں کا شوقین تھا۔ وہ دن میں لاتعداد انڈے کھا سکتا تھا۔ مگر اس میں شراب یا سگریٹ پینے کی عادت بالکل نہیں تھی۔ سنجے کا ایک اور بچپن کا دوست بتاتا ہے کہ اس کا کمرہ کھلونوں سے اٹا ہوتا تھا۔ مگر وہ کھلونے چھوڑ کر سپرنگوں اور پرانے ٹکڑوں میں مصروف رہتا تھا۔

سنجے [illegible] خطرے [illegible] واقف تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس سیکنڈ ہینڈ لینڈ روور میں آیا۔ اور مجھے ہمراہ چلنے کو کہا۔ وہ جیپ [illegible] ایک پہاڑی کی چوٹی کے قریب [illegible] والی سڑک پر لے گیا۔ اور پھر اسے موڑ کر کھلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے بریکیں کام کر رہی تھیں۔ ورنہ میں آج یہ قصہ سنانے کو موجود نہ ہوتا۔

سنجے کو سالگرہ کا تحفہ دینا ایک نہایت مشکل بات تھی۔ وہ ایسی کسی بات کو پسند ہی نہ کرتا تھا۔ اگر آپ اسے کوئی چیز دے بھی دیں تو ہو سکتا ہے، وہ کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس کی تعریف کر دے یا اسے پہلے نظر آ جائے۔

سنجے میں ایڈونچر کی صحیح سپرٹ تھی۔ ایک دفعہ ہم سب کاربٹ پارک گئے، تو آدھی رات کو سنجے ہمیں ہائی کنگ کے لئے لے گیا، اور ہم سب نے دریا کے ساتھ ساتھ دوڑ لگائی۔

ایک دفعہ میں اس کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لئے شملہ گیا۔ آدھے راستے تک وہ ہمیں [illegible] رہا کہ ہم سری نگر کی طرف چلیں۔ دوست زیادہ تھے، اس لئے ووٹ ڈالنے کا منصوبہ [illegible] نے سری نگر کی حمایت کی۔ چنانچہ جیپ کا رخ سری نگر کی طرف موڑ دیا گیا۔ اور [illegible]

دو دن تنزلے۔

سنجے کے بہت سے دوستوں اور واقفکاروں کا خیال ہے، کہ وہ ایڈوانچر کا دلدادہ، مضبوط اور پکے ارادے والا تھا، اور خوف نام کی کوئی چیز اس کی زندگی میں شامل نہیں تھی۔

الزبتھ گابا کے سکول سے سنجے میسوری میں ویل ہام سکول گیا، اور وہاں سے ڈیرہ دون —

گوتم دیرہ جو سنجیر ہاؤس میں سنجے کا کلاس فیلو تھا، اپنی یادداشتوں کے حوالے سے کہتا ہے:۔

سنجے سنجیدہ طالب علم نہیں تھا۔ وہ انگریزی کے پیریڈ میں آخری قطار میں میرے سامنے ہی بیٹھا کرتا تھا۔ ہم بڑی دلچسپ کتابیں پڑھا کرتے تھے، مثلاً لورنا ڈون اور حاجی بابا اصفہانی۔ لیکن سنجے کے لئے ان میں کوئی چاشنی نہ تھی۔ اسے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی کالج کلر حاصل کرنے یا کلاس مانیٹر یا سکول پریفیکٹ بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ عام طور پر خاموش اور سنجیدہ رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ شرمیلا ہو۔ وہ مصنوعی طریقے سے لوگوں کی دوستی یا ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد میری اس سے ملاقات ایک امریکن سکول کی دعوت میں ہوئی۔ میں نے اس میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی۔ وہ ویسا ہی خاموش اور سنجیدہ تھا۔ اور کسی قسم کا جوشیلا پن نہ تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنی دس آرزو پوری کرنے یعنی موٹر کار تیار کرنے کی تعلیم کے لیے برطانیہ چلا گیا۔ تین سال تک وہ رولز رائس کار یونٹ میں بطور اپرنٹس کام سیکھتا رہا۔

سنجے اپنی صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بھارت واپس آیا۔ اس نے طوس آغاز کیا۔ اس نے سبزی منڈی کے علاقے میں ورکشاپ قائم کی۔ اور تین مستری ملازم رکھے۔ علیم الدین، تسی دام اور نارائن دت چودھری۔ یہاں وہ سارا دن کار کے انجن بنانے میں لگا رہا۔ ۱۹۶۹ میں وہ پہلی کار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

تیوتی کار بنانے کا منصوبہ بنی سیڈ میں منظور کر لیا گیا۔ سنجے ان سترہ لوگوں میں شامل تھا جنہوں ۔ ۔ ۔ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ دوسرے درخواست دہندگان میں ٹاٹا، ٹیلکو اور ... اور ... شامل تھے۔ تین بڑے درخواست ... ... منظور ہو گئیں، کیونکہ وہ غیر ملکی

امداد چاہتے تھے۔ صرف سنجے گاندھی کو اجازت نامہ ملا۔ باقیوں نے معروضات واپس لے لیں۔ ۱۹۷۰ میں سنجے نے تمام کارروائیاں پوری کر لیں۔

ماروتی (ہوا کی دیوی کا بیٹا) بہت دیر بحث کا موضوع رہا۔ بہت سی بحثوں کا مقصد اندرا گاندھی کی ذات پر حملہ تھا۔ لیکن نیزوں کا رُخ سنجے گاندھی کی جانب تھا۔ وہ ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر حملہ آور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے متعلق تھے، اور اخبار بھی اس میں شامل تھے۔ حقائق پر کوئی بھی نہیں تھا۔ ماروتی پر صرف ایک ہی اعتراض کیا جا سکتا تھا، کہ اس کی پیداوار بہت کم تھی۔ اگرچہ دوسری تمام کاروں کی نسبت ارزاں تھی۔ تاہم یہ عوام الناس کی سواری نہ بن سکی۔ سنجے پر بھی موردِ الزام ہیں۔ سپیئر پارٹس بنانے والی فیکٹریوں اور خام مال کی قیمت میں اضافہ اس کا باعث تھے۔ سنجے ایک بڑے قرضے کے نیچے دب گیا۔ سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کے حصص عوام میں تقسیم بھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس نے قرض اتارنے کی خاطر بسوں اور روڈ رولرز کو اسمبل کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ ماروتی میں واپس آ چکا تھا۔ ماروتی کاریں لاتعداد مقدار میں شمالی بھارت میں دیکھی جا سکتی ہیں، اور یہ سو فیصد سودیشی ہیں۔

۱۹۷۴ میں سنجے نے اٹھارہ سالہ مانیکا سے شادی کر لی۔ مانیکا سکھ کرنل ٹی ایس آنند اور مسز امیتشور آنند کی بیٹی ہے۔ اس کے ماں باپ غیر منقسم پنجاب کے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مانیکا ایک لمبی تڑنگی خوبصورت کالج بیوٹی کوئین ہے۔ اس کا پہلا خوق صحافت تھا۔ وہ ایک باتصویر ہفت روزہ سوریہ بھی نکال رہی ہے۔ مہاتما گاندھی کے یومِ پیدائش (یعنی ۲ اکتوبر ۱۹۷۶) کو پہلے شمارے کی توقع ہے۔

مسز اندرا گاندھی کے علاوہ بھی سنجے کے کئی نقاد ہیں۔ سنجے کیا کر رہا ہے، وہ کس کی ذمہ داری پر کر رہا ہے۔ نقادوں کا سوال ہے۔ میں انہیں جوابی طور پر سوال کر سکتا ہوں۔ کیا وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ سنجے غریب لوگوں کے لئے جو کچھ کر رہا ہے، وہ ہماری قوم کے لئے فائدہ مند ہے، ... ... ہمارے پسماندہ علاقے بہتری نہیں چاہتے؟ کیا ہمیں آبادی پر قابو نہیں پانا؟ کیا ہمیں جنگل

کی حفاظت نہیں کرنا چاہیے؟ کیا بدعنوانی کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیے؟ تو پھر ایسے شخص کے لئے پریشانی کیوں، جو یہ سب کچھ کر رہا ہو۔

بیجنے نے اپنے جوان کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل اور کٹھن سفر ہے۔ اس کے راستے میں کیلے کے چھلکے مت پھینکو۔ خوشحال بھارت کی خاطر اس کے سفر میں اس کا ساتھ دو۔ ہم بوڑھی نسل صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنے خوابوں پر عمل پیرا ہونے دو۔

گورو گول والکر

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی خطا کے بغیر ہی ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں گورو گول والکر میرے لیے سرفہرست تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں آر۔ ایس۔ ایس کی شمولیت، مہاتما گاندھی کا قتل، ہندوستان کو سیکولر سے ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کا مطالبہ۔ یہ سب باتیں اس سے منسوب تھیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے میں اسے ملے بغیر نہ رہ سکتا تھا

میرا خیال تھا کہ مجھے سوایم سیوکسوں (محافظوں) کی ایک فوج سے گذر کر جانا ہوگا لیکن وہاں تو سفید کپڑوں میں ملبوس سی آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں تھے جو کم از کم گاڑی کا نمبر ہی نوٹ کر لیتے۔ یہ ایک درمیانے طبقے کا گھر تھا جو پوجا گھر کی طرح نظر آ رہا تھا کمرے کے باہر زنانہ جوتوں کی ایک قطار، اگربتی کی خوشبو، پردے کے پیچھے عورتوں کی کھسر پھسر، برتنوں کی جھنکار، ایک چھوٹے سے کمرے میں تقریباً ایک درجن لوگ سفید کرتوں اور تہبند دھوتیوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہا دھو کر آئے ہیں اور ان کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مہاراشٹر کے براہمن ہیں

گورو گول والکر، ساٹھ کے پیٹے میں ایک دھان پان سا شخص ہے۔ اس کے کالے بال کندھوں پر گر کر گھنگھریالے ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ مونچھوں کے نیچے چھپے ہوئے کھچڑی داڑھی لمبی ہے اور ٹھوڑی کے نیچے تک جاتی ہے گہری آنکھیں اور دائمی مسکراہٹ وہ ایک بھدی رنگی ہوچی منہ کی مانند نظر آتا ہے حال ہی میں اس نے سینے کا بڑا آپریشن کرایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

چونکہ وہ ایک گرو ہے اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ ایک چیلے کی سی فرمانبرداری کا

متوقع ہوگا۔ جونہی میں اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکا اس نے اپنی مضبوط انگلیوں میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔ "مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی" اس نے کہا "مجھے اس کی خواہش بھی تھی ـــ" اس نے بڑی شستہ ہندی میں کہا۔

"مجھے بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔" میں نے کہا۔ خاص طور سے جب سے میں نے آپ کی کتاب "BUNCH OF LETTERS" پڑھی ـــ "BUNCH OF THOUGHTS ـــ" وہ میری تصحیح کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کتاب کے متعلق میرے نظریات معلوم کرنے سے لاتعلق ہے۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتا ہے اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ "پھر ـــ؟"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے انٹرویو شروع کروں۔ "مجھے علم ہوا ہے کہ آپ شہرت سے احتراز کرتے ہیں اور آپ کی تنظیم خفیہ ہے ـــ؟"

ج:۔ یہ درست ہے کہ ہم شہرت پسند نہیں کرتے لیکن ہماری تنظیم میں کوئی خفیہ بات نہیں۔ جو کچھ تم پوچھنا چاہتے ہو بلا تکلف پوچھو ـــ

س:۔ میں نے جیک کیورن کی تحریر آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو قسطائیت میں آپ کی تحریک کے بارے میں پڑھا تھا ـــ

ج:۔ وہ سب تعصب پر مبنی ہے۔" گرو جی مداخلت کرتے ہیں۔ "غلط اور نادرست اس نے میری طرح اور بھی غلط ریفرنس پیش کیے ہیں۔ ہماری تحریک میں کوئی تشدد نہیں ہم تو ڈسپلن کے قائل ہیں اور یہ تشدد سے بالکل مختلف شے ہے۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ ایک مضمون میں کیورن کو یورپ اور افریقہ میں سی آئی اے کے آپریشن کی کمان حاصل تھی تو انہوں نے کہا

"میں ایسا شک نہیں کرتا ـــ لیکن میں بڑی بے ساختگی سے کہتا ہوں ـــ" میں اسے گزشتہ بیس سال سے جانتا ہوں ـــ"

گرو جی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں ـــ میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ـــ معلوم نہیں ان کا یہ تبصرہ میری بے ساختگی پر تھا یا کیورن کے سی آئی اے

کے ہمراہ ہونے پر ـــ

س:۔ R S S کے بارے میں ایک چیز مجھے پریشان کرتی ہے ـــ اگر آپ اجازت دیں تو پوچھوں ـــ

ج:۔ بات جاری رکھو ـــ

س:۔ اور وہ چیز اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے آپ کا طرزِ عمل ہے

ج:۔ ہم عیسائیوں کے بالکل خلاف نہیں۔ لیکن جب وہ کسی بیمار کو دوا یا بھوکے کو خوراک دیتے ہیں، تو اس وقت اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں گویا صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیں کھٹکتی ہے مجھے خوشی ہے کہ بھارت میں گرجا گھروں کو روم کے زیرِ اثر سے آزاد اور خود مختار بنانے کی تحریک ہوئی ہے۔

س:۔ اور مسلمان ـــ؟

ج:۔ ان کے بارے میں کیا الزام ہے ـــ؟

مسلمانوں کی پاکستان اور بھارت دونوں کے ساتھ وفاداری پر انہیں الزام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تاریخی عناصر کے حساب سے ہندوؤں پر بھی اتنا ہی الزام عائد ہوتا ہے تقسیمِ ملک سے لے کر اب تک انہیں عدمِ تحفظ کا احساس رہا ہے۔ لیکن پھر بھی چند لوگوں کے جرم کی سزا تمام قوم (مسلمانوں کی) کو نہیں دی جا سکتی

س: گورو جی ـ بھارت میں چھ کروڑ کے قریب مسلمان ہیں ـــ میں ذرا جوش میں آتا ہوں ـــ "ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں نکال نہیں سکتے ہم انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا گھر ہے۔ ہمیں ان کو محفوظ بنانا چاہیے کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھیں ـ ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں محبت سے فتح کریں۔

ج: میں اس سے بالکل اتفاق کرتا ہوں ـــ گورو جی مداخلت کرتے ہیں ـــ [illegible] [illegible] چاہوں گا کہ [illegible] کی مدد سے ان کو مطیع بنانا چاہیے ـــ

[illegible] سمجھتا ہوں کہ گورو جی لفظوں سے کھیل رہے ہیں ـ [illegible] جو کچھ [illegible] [illegible] ہے وہ اس پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی بات کی وضاحت کرتے ہیں [illegible]

اسلامی کا ایک وفد مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ مسلمانوں کو بھول جانا چاہیئے کہ وہ کبھی ہندوستان پر حکومت کرتے تھے اور نہ ہی انہیں دوسرے مسلمان ممالک کو اپنے وطن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ انہیں ہندومت کی بالادستی قبول کرنی چاہیئے۔"

س: وہ کیسے؟"

ج: ہمیں انہیں سمجھانا چاہیئے۔ بعض اوقات ہم مسلمانوں کے اعمال پر سخت برہم ہوتے ہیں لیکن ہندوؤں کا خون دائمی نفرت نہیں رکھتا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ میں رجائیت پسند ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ہندومت اور اسلام ساتھ ساتھ رہنا سیکھ جائیں گے۔"

چائے پیش کی جاتی ہے۔ گوروجی شیشے کے مگ میں چائے پیتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے باقی سب کی طرح چینی مٹی کے کپ میں چائے کیوں نہیں پی۔ وہ مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس کپ میں چائے پی ہے اور جہاں کہیں جاتے ہیں اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا قریب ترین رفیق کار ڈاکٹر ٹھٹھے جس نے اپنی زندگی R.S.S کے لیے وقف کر رکھی ہے وضاحت کرتا ہے کہ پورسلین آہستہ آہستہ اپنی سطح چھوڑ دیتی ہے اور نیچے کی مٹی نمایاں ہو جاتی ہے جو جراثیم پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میں اپنی گفتگو کی طرف لوٹتا ہوں۔

س: آپ مذہب کو بنیادی کیوں بناتے ہیں جبکہ دنیا میں ہر جگہ مذہب سے اجتناب ہوتا جا رہا ہے۔ لاادریت کا دور دورہ ہے۔

ج: ہندومت کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں کیونکہ اس کے کوئی نظریات نہیں۔ پہلے اس میں لاادریت تھی۔ اگر مذہب سے اجتناب کا دور آگیا تو ہندومت اس کا بہتر مقابلہ کر سکتا ہے۔

س: آپ کیسے کہہ سکتے ہیں دنیا میں جتنے مذاہب کو استحکام حاصل ہوا ہے یا انہوں نے لوگوں پر گرفت مضبوط کی ہے ان کے پیچھے نظریات ہی تھے مثلاً کیتھولسزم اور کیتھولسزم سے بڑھ کر اسلام۔

ج: یہ عبوری دور ہے۔ لاادریت ان پر قبضہ کرے گی لیکن ہندومت اس کے غلبے

میں بھی آئے گی۔ ہندومت معروف معنوں میں مذہب نہیں یہ تو دھرم ہے۔ زندگی گزارنے کا طریقہ۔ ہندومت، لاادریت کو اپنی تقلید پر مجبور کر دے گی۔

مجھے گوروجی کے پاس نصف گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ان کے چہرے پر بے صبری یا اکتاہٹ کے کوئی آثار نہیں۔ جب میں ان سے اجازت لیتا ہوں تو وہ ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تاکہ میں ان کے پاؤں نہ چھوؤں۔

کیا میں ان سے متاثر ہوا تھا؟ ہاں میں مانتا ہوں۔ انہوں نے اپنا نقطہ نظر مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ناگپور میں ان سے ملاقات کی پیشکش منظور کر لی میں کوشش کروں گا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد جو کہ R.S.S کا بنیادی مقصد ہے۔ میں کامیاب ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں انہیں اس بات پر مجبور کر دوں یا ہو سکتا ہے کہ میں ایک عام ذہن والا سکھ ہی ثابت ہوں۔

جے۔ پی۔ ایک مکمل انقلابی

گزشتہ سال بھارت کی تقدیر بدل دینے والی دو اہم تبدیلیاں رُونما ہوئیں[1]۔

پہلی:- جے۔ پی نے عوامی تحریک میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ اگر اسے کامیابی ہوئی تو ہمارے آئین سازوں کی جمہوریت کو تار تار کر دے گی۔ جے۔ پی اور اس کے پیروکار اپنی بے پناہ تخریبی طاقت کا اندازہ نہیں رکھتے۔ جو جیسا بیجیں گے، ویسا ہی کاٹیں گے۔

دُوسری:- حکمران جماعت یعنی کانگریس اور سی۔ پی۔ آئی —— جے۔ پی کی طاقت کا شعور نہیں رکھتے۔ ایک بگلے کی طرح طوفان دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

بھارت کے شہریوں کو جے۔ پی کی انقلاب کی دعوت پر غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔

جے پرکاش نرائن ایک عظیم آدمی اور اچھا انسان ہے۔ وہ ایک دُسرا انسان ہے۔ اور اس نے کبھی ناپسندیدہ کاموں میں برتری نہیں دکھائی —— اُس نے صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالا ہے۔ مثلاً شیخ عبداللہ کی گرفتاری —— ناگالینڈ میں بھارتی فوجوں کا ناگاؤں کا قتل عام —— پاکستان کو نمبر ایک دشمن سمجھنا، اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی، جس کی وجہ سے، وہ پاکستان میں سب سے زیادہ نفرت کیا گیا!۔

نیپال کے سابق وزیر اعظم نے اُسے برصغیر کی علیحدہ، الگ، توانا آواز کہا —— دنیا بھر کی جمہوریتوں میں سب سے زیادہ جمہور کی آواز —— آندری میلراکس نے اُسے گاندھی کے بعد

[1] یہ مضمون ۱۹۷۵ کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔

جے پرکاش تحریک آزادئ ہند میں شامل تھا۔ مہاتما گاندھی نے جب طالب علموں کو کالج چھوڑ کر تحریک چلانے کو کہا، تو اس نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ ۱۹۴۲ کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کا سب سے بڑا روحِ رواں تھا۔ (جب اُس کے اصل دشمنوں اور آجکل کے کمیونسٹوں نے انگریزوں سے ساز باز کی تھی) ۱۹۶۷ میں اُس نے ذاتی حیثیت میں بہار کے قحط زدہ لوگوں کو موت کے منہ سے بچایا۔ اس نے کئی سال سرودیہ اور بھودان کی تحریکوں میں صرف کیئے۔ ۱۹۷۲ میں چنبل کی وادی کے ڈاکوؤں کا صفایا حکومت، پولیس یا فوج کی بجائے جے پرکاش نے کیا تھا۔

ان سب مہمات نے جے پرکاش نرائن کو ایک جائز خطاب عطا کیا۔ "قوم کے ضمیر کو زندہ رکھنے والا۔" اس نے کبھی کسی عہدہ کی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ اس لیئے دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس اُس کی بے انتہا عزت کی جاتی ہے۔ وہ کون سی قوتیں تھیں، جنہوں نے ایک انسان کو اس درجے تک پہنچایا۔

جے پرکاش ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ کو بہار کے ایک گاؤں ستابدین میں کائستھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک معمولی سرکاری ملازم تھا۔ وہ چھ بچوں میں سے تیسرے نمبر پر تھا۔ چند سال گاؤں کے پرائمری سکول میں گزارنے کے بعد وہ پٹنہ کے ہائی سکول میں بھیجا گیا۔ وہ سکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر ویٹ مور سے بہت متاثر ہوا۔ مہاتما گاندھی نے طالب علموں کو تعلیم چھوڑنے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم دیا، تو ہم نے امتحان دینے سے انکار کر دیا۔ مسٹر ویٹ مور سوائے سزا دینے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پہلے اُس نے ہمیں سزا دی، کہ یہ اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر اُس نے ہماری حُب الوطنی پر ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس کے احساس فرض اور ہمارے ساتھ ہمدردی کے رویے نے ہمیں خاصا متاثر کیا ——" جے پرکاش دہراتا ہے۔

اپنی شاندار جسمانی ساخت کے باوجود جے پرکاش کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ——

"میں اپنا فارغ وقت بھی پڑھنے میں گزارتا تھا۔ میرا باپ مجھے بوڑھا لڑکا کہا کرتا تھا۔"

پندرہ سال کی عمر میں جے پرکاش نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی، اور ایک پکے قوم پرست اور مالدار وکیل کی بیٹی پربھاوتی سے شادی کر لی۔

مہاتما گاندھی کے اس حکم پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے جے پرکاش ماضی کو یاد کرتا ہے۔ فائنل امتحان دینے سے ایک ماہ قبل مولانا آزاد پٹنہ آئے اور جے پی سے کہا، "جب تک، گاندھی جی ایسے مدرسے نہیں کھولیں گے، جہاں بچوں کو قوم پرستی کی تعلیم دی جائے، لوگ کہتے ہیں، کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں سے نہیں اٹھائیں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا، کہ ہم اس وقت تک زہر پیتے جائیں گے، جب تک ہمیں نکوٹین فراہم نہ کی جائے۔"

جے پرکاش نے سالانہ امتحان نہیں دیا۔ اگست ۱۹۲۲ میں اُس نے گاؤں کو خیرباد کہا، کلکتہ سے ایک جہاز پر سوار ہوا، اور دو ماہ بعد سان فرانسسکو جا پہنچا۔ وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لئے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک فارم پر ملازمت حاصل کر لی۔ بعد ازاں وہ پھلوں کو محفوظ کرنے کی فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ وہ برکلے یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لئے اس نے آئیوا اسٹیٹ یونیورسٹی میں مائیگریشن کروالی۔ وہاں چند سمر گزارنے کے بعد وہ وسکونسن چلا آیا۔ "مجھے امریکی دوست اچھے لگے۔ میں لڑکیوں کے ساتھ ڈانس پارٹیوں میں جانے لگا۔ انہوں نے میرا انگریزی نام 'جیری' رکھ دیا۔"

امریکہ میں ہی جے پرکاش ایک پکے قوم پرست سے مکمل مارکسٹ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ پولش یہودی ابوردم لینڈی سے متاثر ہوا۔ لینڈی ایک ذہین طالب علم، شاعر اور کیمونسٹ تھا۔ لینڈی نے جے پرکاش کو بھارتی کیمونسٹ پارٹی کے ورکروں یعنی ایم۔ این۔ رائے سے متعارف کرایا۔ وہی رائے جس نے بعد میں عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ گاندھی جی کی آہنسا کی تحریک کے بالکل مخالف ـــــ

جے پی امریکہ کی کیمونسٹ پارٹی کے علمی شعبہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے لینن، ٹراٹسکی،

روزا لکسمبرگ اور کارل کاؤتسکی کا مطالعہ کیا۔ میں نے 'داس کیپٹل' کے چند ابواب بھی پڑھے۔ اور ایک میکسیکن ایمانوئیل گومز نے جے پرکاش کو سائنس اور حساب کی بجائے سوشیالوجی کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ اور اس نے اورنیٹل یونیورسٹی آف ماسکو میں داخلہ لینے کو کہا۔ اسے روس میں داخل ہونے کے لئے چار سو ڈالر کی ضرورت تھی۔

جے پرکاش یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ امریکہ اس وقت معاشی بحران سے دوچار تھا۔ جے پرکاش ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری تک کوشش کرتا رہا، لیکن کہیں سے مدد حاصل نہ ہو سکی۔ غیر ملکیوں اور کالوں کو روزگار نہ ملتا تھا۔ بعض جگہ پر تو ہندوؤں پر ملازمت حاصل کرنے کی پابندی تھی۔

بالآخر جے پرکاش کو ایک جگہ چپڑاسی کی نوکری ملی اور اس نے اوہیو میں کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس نے بیچلر ڈگری کے ساتھ ساتھ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نو سو ڈالر سالانہ کی گریجویٹ امداد بھی حاصل کی۔ اس نے ایم۔ اے تجزیہ کردار کی سائنس میں کیا، اور سالانہ امتحان میں سو فیصد نمبر حاصل کیئے۔ فارغ اوقات میں وہ کلیولینڈ کی ایک ٹریڈ یونین کے دفتر میں کام کرتا رہا۔

جے پرکاش ۱۹۲۹ میں بہار واپس آیا۔ امریکہ کے متعلق اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "میں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے کیمونسٹ مجھے امریکی ایجنٹ کہتے ہیں۔ امریکہ میں میں نے سرنگوں، فیکٹریوں اور مذبح خانوں میں ملازمت کی۔ میں نے بیراگری کی۔ اور بعض اوقات تو ہوٹلوں میں کموڈ بھی صاف کیئے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ پھر میں مارکسٹ ہو گیا۔ لیکن سٹالن نواز نہ بنا۔ جب میں ہندوستان واپس آیا، تو میں کیمونسٹ تھا۔ لیکن میں نے کیمونسٹ پارٹی کی بجائے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔

جے پرکاش بھارتی سیاست میں شامل ہو گیا۔ پہلے اس نے کیمونسٹوں کو دیکھا، صنعتی قوّل کے لیڈر جیل میں تھے۔ دوسروں نے اسے متاثر نہ کیا۔ اس دوران اپنے شوہر کی سات سالہ

غیر حاضری میں پربھاوتی گاندھی جی کی پیروکار بن گئی۔ وہ واردھا کے گاندھی آشرم میں جے پرکاش کو لے کر گئی۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ مختصر سی ملاقات میں ہی جے پرکاش کے اختلافات ہو گئے۔ پہلے وہ گاندھی جی کی بہت سی تعلیمات مثلاً چرخہ بانی اور سبزی خوری کو جائز سمجھتا تھا۔ پربھاوتی نے اُسے مجبور کیا، کہ آشرم میں گاندھی جی کے سیکس کے خلاف نظریئے کو بھی مان لے۔ کچھ دیر جے پرکاش اپنے اس نظریئے پر قائم رہا، کہ گاندھی جی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ گاندھی کے پیروکار گاندھی کو اتنا نہیں جانتے تھے، جتنا گاندھی اپنے پیروکاروں کو۔ مہاتما گاندھی نے پیشن گوئی کی، کہ ایک دن جے پرکاش اُن کی زبان بولے گا۔ ۱۹۳۰ میں جواہر لعل نہرو نے بھارت کا صدر منتخب ہونے کے بعد جے پرکاش سے کہا، کہ وہ کانگرس میں شامل مزدور طبقے کی راہنمائی کرے۔ دو سال بعد وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سیکرٹریوں میں شامل تھا۔ تقریباً اُسی زمانے میں کانگرس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا اور جے پرکاش کو قید کر لیا گیا۔

ابھی وہ مارکسزم سے باہر نہیں نکلا تھا جیل میں وہ سرخوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا، جو گاندھی سے اختلاف رکھتے تھے۔ سکالروں کی طرح نفرت آمیز لہجے میں اُس نے گاندھی کو رجعت پسند کہا، اور گاندھی کے غریبوں کے لئے جذبۂ ترحم کو ایک سرپھرے انسان کی دوستی گردانا۔ گاندھی اپنے نوجوان نقادوں کو صرف ایک خطاب دیتا تھا —— "جلد باز لوگ ——" پھر انہیں کانگرس کے سوشلسٹ گروپ میں داخل کر دیتا تھا۔

جے پرکاش گاندھی کی نسبت نہرو کے زیادہ قریب تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران گاندھی کو چھوڑ کر نہرو کے ساتھ نئی پارٹی بنانے میں جے پرکاش پیش پیش رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بھارت میں انقلاب کا سماجی کام اسی طرح مکمل ہو گا۔ اس نے اعلان کیا، کہ گاندھی جی کے فلسفہ کا وقت گزر چکا ہے، اب اسے زیادہ دیر جاری رکھنا حماقت ہے۔ اب ہمیں سوشلزم کے جھنڈے تلے مارچ کرنا چاہیئے۔

گاندھی، نہرو اور جے پرکاش کے خیالات جنگ عظیم کے متعلق ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ گاندھی اہنسا کے چکر میں تھا، نہرو فاشزم کے خلاف اور مارکسٹ جے پرکاش اس سامراجی جنگ کو عوام کی جنگ آزادی بنانے کے درپے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اینٹی برطانیہ کہتا تھا۔ سب کے سب برطانوی جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی جے پرکاش کا نام بھارت میں عام ہوا۔ قید خانے میں دھوتیوں کو گانٹھیں لگا کر اس نے چھ میٹر لمبا رستہ بنایا اور جیل سے بھاگ نکلا۔ اس نے بڑے پیمانے پر تباہی کو منظم کیا۔ ریلوے لائنیں اکھاڑ دیں، سڑکوں پر بم پھینکے اور مشرقی محاذ پر فوجی دستے اور گولہ بارود بھجوایا۔ وہ پکڑا گیا۔ مگر وہ ایک ناقابل فراموش ہیرو بن چکا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا ادراک ہو گیا کہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر طاقت کا استعمال درست نہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جب سیاسی بھارتی حقنہ کے لئے منتخب ہوا، تو اس نے اپنے دوست کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا دوست جے پرکاش اتنا بے ضرر ہے کہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ جے پرکاش نے آگرہ جیل سے اسے لکھا "کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف ان شریف آدمیوں کو جو مکھی بھی نہیں مار سکتے، جیل سے رہا کرنا چاہیئے ——؟"

۱۹۵۳ء تک جے پرکاش نے عوام میں اپنے مارکسی ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اُس نے پونا میں تین ہفتے کا برت رکھا۔ "میں نے تین ہفتے سوچ بچار میں گزارے ہیں ——" اُس نے ایک دوست کو خط لکھا۔ "میں نے مارکسزم کی فلسفیانہ بنیادوں کو مسترد کر دیا ہے۔ جدلیاتی مادیت وغیرہ۔ کیونکہ ان میں مجھے اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ کوئی شخص کیوں اچھا ہو، یا کسی شخص کو کیوں اچھا ہونا چاہیئے ——؟"

بھودان پروگرام کے دوران سرودیا تحریک کے زیر اثر بالآخر جے پرکاش نے ترجیح دلوانے میں خصوصیت کرتے ہوئے گاندھی جی کا راستہ اپنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ ممالک کا سب سے بڑا نقاد بن گیا۔ ۱۹۵۶ء میں روس کے ہنگری پر، اور ۱۹۵۹ء میں چین

کے تبت پر قبضے کی اس نے مخالفت کی۔ جے پرکاش نے کبھی وضاحت نہیں کی کہ "مکمل انقلاب" سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ تعریفوں یا وضاحتوں سے ہمیشہ گھبراتا ہے۔ لیکن اس کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ بھارت کے عوام کی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی اقدار کو از سرِ نو ترتیب کرنا چاہتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے ستائیس سال بعد بھی لوگ بھوکے ہوئے ہیں۔ بھوک ہوئی ہوئی قیمتیں اور بدعنوانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ عوام ہر قسم کی ناانصافی کا شکار ہیں۔ ۱۹۷۵ میں پٹنہ میں عوام کو انقلاب کی طرف راغب کرتے ہوئے اس نے کہا، "تعلیمی ادارے بدعنوان ہو چکے ہیں۔ ہزاروں نوجوان تاریک مستقبل کا سامنا کرتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ غریب لوگوں کا کام دن بدن کم ہو رہا ہے۔ جداراضی کے قانون وضع کئے جا رہے ہیں، مگر بے گھر لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ——"

اس کے مخصوص نشانے میں ریاستی مقننہ آتی ہے۔ بہار کی قانون ساز اسمبلی کو ایک کھلے خط میں اس نے لکھا، "دستور اگرچہ ۱۹۷۲ کے عام انتخابات نے آپ کو عوام کا نمائندہ ثابت کیا۔ مگر آپ اپنا حق نمائندگی کھو چکے ہیں۔ اور اس کے مزید قابل نہیں، کہ یہ نمائندگی کریں۔ ہمارے جمہوری اداروں اور ان کے طریقہ عمل میں اتنی خرابیاں ہیں، کہ کسی بھی مسئلے کو آئینی طریقے سے حل کرنے کی دلیل اپنے معنی کھو چکی ہے ——" اس کے خیال میں دیہاتی کونسلوں کو سیاسی وابستگی کی بجائے کردار کی پختگی کو مدنظر رکھ کر امیدوار منتخب کرنے چاہئیں۔ اور عوامی کمیٹیوں کو ایسے منتخب لوگوں پر گہری نظر رکھنی چاہیئے۔

اس کے پروگرام میں گھیراؤ، دھرنا دینا اور بطور احتجاج برت شامل ہیں۔ اس نے مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گروپ تشکیل دیئے ہیں، تاکہ وزیروں اور اعلیٰ افسروں، تاجروں اور بڑے زمینداروں کے بچوں کو مجبور کیا جائے، کہ وہ بدعنوانی ختم کرنے کے لئے اپنے اپنے گھر میں کم از کم بارہ گھنٹے کا برت رکھیں۔ تاکہ ان کے بڑے بدعنوانی جیسی لعنت کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس نے فوج اور پولیس سے اپیل کی ہے، کہ وہ عوام کو سفاکانہ طور پر قتل کرنا بند کر دیں۔ اور عوام سے اپیل

کی ہے، کہ وہ لاٹھیاں کھانے، گولیاں کھانے، جیل جانے اور جائداد قرق کروانے کی پرواہ نہ کریں۔ تاہم یہ سب کچھ تشدد کے بغیر ہونا چاہیئے۔ آگ زنی یا لوٹ کھسوٹ انقلاب نہیں لاتے۔ ہمیں گاندھی جی کی طرف لوٹنا ہوگا۔

مینو مسانی، جے پی کا ایک قریبی آدمی کہتا ہے، "اس آدمی کی دیانت بے مثال ہے —— شائد وہ بھارت میں بہترین جمہوریت کی آخری اُمید ہے۔ اگر اُس کی صحت نے اجازت دی (کیونکہ اس کی عمر ۷۲ سال ہے، اور وہ شوگر کے ساتھ مل کا مریض بھی ہے) تو وہ کامیاب ہوگا —— تاریخی قوتیں اُس کے ساتھ ہیں ——"

نارائن کے لئے جو جذبہ مینو مسانی کا ہے، وہ رجنی پٹیل کا نہیں۔ جو اس وقت بمبئی کانگرس کمیٹی کا صدر ہے۔ اور گاندھی کا کیمبرج یونیورسٹی کے زمانے کا رفیق ہے۔ اُسے مہاراشٹر کا بادشاہ گر بھی کہا جاتا ہے۔ پٹیل کسی زمانے میں لیکا کمیونسٹ تھا۔ اور آزادی کی تحریک کے دوران حکومتِ برطانیہ نے اسے جیل میں لاڈالا جس میں مسانی اور نارائن بھی تھے۔ میں نے اسی ٹرین میں سفر کیا، جس میں جے پی احمد آباد سے بمبئی لایا گیا تھا۔ اُس کا استقبال کرنے والے لوگ بہت تھوڑے ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف صحافیوں کا کام ہے، جو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ وہ (جے پی) ایسے بایئس کرتا رہا ہے، جیسے گاری بالدی، لینن اور مہاتما گاندھی کی روحیں اس اکیلے میں جمع ہو گئی ہوں۔ جوں جوں اُس کے ذہن کا انتشار بڑھتا گیا، اُس کی کوششیں ناکام نظر آتی گئیں ——

پٹیل اور مسانی کے تاثرات بالکل الگ الگ ہیں۔ انتظامیہ اسے ایک غیر ذمہ دار، انتشار پسند فرد سمجھتی ہے۔ جو جمہوریت کے خلاف لوگوں کے جذبات بڑھکاتا ہے۔ اُس کے معترف اُسے گاندھی حکومت اور کرپشنسٹوں کی تباہ کردہ جمہوریت کا محافظ سمجھتے ہیں۔

دونوں کی آرا ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے خود نا شزم کا ثبوت ہیں۔

جے پرکاش کسی پارٹی کا سربراہ نہیں، اور نہ ہی وہ اپنی تحریک کو کسی پارٹی کے زیرِ اثر گردانتا ہے۔ اندرا گاندھی کے نوسالہ عہدِ حکومت کو ختم کرنے کے لئے حزب اختلاف، انتہائی دایاں بازو

جن سنگھ، آر ایس ایس، اور دوسری طرف آنند مارگ، سوشلسٹ، انتہا پسند مارکسٹ اور مارکسٹ لینینسٹ گروپ اس کی میٹنگ میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے بہت سے ہمدردوں میں ایسے سیاستدان بھی ہیں، جن کو کمیونسٹ بدعنوان کہتے ہیں۔ ایسے صنعتکار بھی ہیں، جو پارلیمنٹ کے آزاد رکن ہیں۔ جیسے رام ناتھ گوانیکا جو ایکسپریس کا مالک ہے، اور جو جے پی کا ہفت روزہ ایوری مینز ویکلی نکالتا ہے۔

اس وقت حکومت اور ماسکو نواز کمیونسٹ تمام حزبِ اختلاف سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اور انہوں نے کئی ضمنی انتخابات میں سابقہ امیدواروں کو شکست دے کر کانگرس کو مضبوط بنا لیا ہے۔

جے پرکاش بہار میں نہایت ہی مضبوط امیدوار ہے۔ بہار اور ملحقہ مشرقی علاقوں مثلاً اتر پردیش میں اس کے پیروکاروں کی تعداد نوے فیصد کے قریب ہے۔ ملک کے باقی علاقوں میں یہ سطح حکومت کے خلاف لوگوں کی تحریک پر مبنی ہے۔ طالب علموں کی بہت بڑی تعداد اس کی "تعلیم چھوڑ دو" کی پالیسی پر عمل نہ کرنے کے باوجود اس کی مددگار ہے۔ کانگرس یا کمیونسٹوں کے زیرِ اثر ٹریڈ یونینوں نے اس کی ہڑتال کرنے کی اپیلوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جلسوں میں جن میں سب سے بڑا بمبئی میں ہوا، زیادہ تعداد میں لوگ، انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ حالانکہ ساری آبادی کا تقریباً تین فیصد انگریزی بولتا ہے۔ مینو مسانی کا کہنا ہے، کہ یہ ایک درمیانے درجے کا انقلاب ہے، جس کی راہنمائی جے پی کر رہا ہے، اور وہ خوش ہے کہ اس میں نوجوان شامل نہیں ہیں۔

تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ جے پی کی تحریک صرف اس کی شخصیت کی وجہ سے کامیاب ہے کیونکہ وہ بیک وقت وہ زبان استعمال کر رہا ہے، جو ملک کا انٹیلیکچول طبقہ بھی سمجھ رہا ہے، اور گلیوں محلوں میں رہنے والا بدحال آدمی بھی۔ کانگرس کے ایک پارلیمنٹ ممبر کا کہنا درست ہے، کہ جے پی کا "مکمل انقلاب" ایک مکمل شکست ہوگی۔

اگرچہ اس چوں چوں مربّہ کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، کہ اس میں بہت سے لوگ، مسز گاندھی مخالفت کی بنا پر شامل ہیں۔ تاہم جے پی کی تحریک کی قوت کو نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا۔ بھارت میں انتخابات امیدواروں کی شخصیت اور نعروں کی بنا پر جیتے جاتے ہیں۔ ۷۲ - ۱۹۷۱ کے انتخابات میں مسز گاندھی کی فتح بنگلہ دیش کا فاتح ہونے کی بنا پر تھی۔ انہوں نے ملک کو ایک نعرہ دیا — "غریبی ہٹاؤ" اور پھر سارا ملک اس سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اور عوام نے اسے "اندرا لہر" کا نام دیا۔ اس وقت سے غریبی ختم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بھی پروان چڑھی ہے۔ اندرا گاندھی کا بت پاش پاش ہو گیا ہے۔

دوسری جانب جے پی کی صورت میں مہاتما گاندھی کی تجسیم ہو گئی ہے۔ اس نے بھی ایک نعرہ دیا ہے "بھرشٹاچار مٹاؤ" یعنی بدعنوانی ختم کرو۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، کہ کانگرس کو ہٹانے کے لئے "جے پی لہر" سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگلے سال جب عام انتخابات ہوں گے، تو اس یدھ کی بڑی توقع ہے۔

جے پی نے کئی مرتبہ یقین دہانی کرائی ہے، کہ اس کی تحریک گاندھی کی طرح عدم تشدد پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں کئی مواقع تشدد کے آئے ہیں۔ گجرات میں ذخیرہ اندوزوں اور، منافع خوروں کے درمیان تصادم میں صوبائی اسمبلی کے کئی ارکان کو مارا پیٹا گیا، اور بالآخر اسمبلی کو توڑنا پڑا۔ جے پی نے گجرات کی مثال دیتے ہوئے مطالبہ کیا، کہ بہار کی قانون ساز اسمبلی بھی معزول کی جائے۔

جگجیون رام جو گذشتہ ۲۵ سال سے بہار سے منتخب ہو رہے ہیں، جے پی کی قوت سے آگاہ ہیں، اور کمیونسٹوں پر جے پی کی طرح تنقید کرتے ہیں۔ بہار اور اتر پردیش کے کئی کانگرس ممبران نے جے پی کے گاندھی جیسے کردار کی تعریف کی ہے۔ بدعنوانی اور جبر کے خلاف جہاد میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ اور مسز گاندھی کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ جے پرکاش کے ساتھ مذاکرات کریں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اگلے انتخاب میں بہت سے لوگ کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جے پی کے زیادہ ہو جائیں۔ اب یہ کوئی راز نہیں رہا، کہ جگجیون رام اور یشونت راؤ چوان مسز گاندھی کو ہٹانے

سے خواہشمند ہیں۔

مسز گاندھی اس دھمکی سے بھی آگاہ ہیں، جو جے پرکاش کی صورت میں اُن کے لئے موجود ہے۔ اُنہوں نے مجھے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا، کہ جے پرکاش کی تحریک میں "احتجاج" کا عنصر نمایاں ہے۔ اور اس ملک میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن پر احتجاج کیا جا سکتا ہے۔

"اگرچہ بہت سی باتیں غلط ہیں۔" اُنہوں نے کہا، "تاہم جے پرکاش کی تحریک یا منشور میں ہمیں اپنے مسائل کا کوئی واضح حل نظر نہیں آتا۔ اس میں شامل بہت سے لوگوں کی رائے ہے، کہ ایک منتخب اکثریت کسی کام کی نہیں۔ اور اگر لوگ اکثریت کو منتخب کرتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے، کہ لوگ غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے، کہ میں اسے فاشسٹ تحریک کہتی ہوں۔"

حیران کن تو بات یہ ہے، کہ جے پی کی تحریک کے بہی خواہ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں عوام بدعنوان کہتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں، کہ پوری تحریک ہی بدعنوان ہے۔ بلکہ میری توقع تو یہ ہے، جو لوگ بدعنوانی کے خلاف ہیں، آئیں، اس تحریک کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ بدعنوانی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، تو پھر آپ کو بدعنوان افراد کو باہر نکالنا ہوگا۔ میں نے مسز گاندھی سے پوچھا، کہ حکومت جے پی کی تحریک کو روکنے میں ناکام کیوں رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا، کہ حکومت نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم لڑائی جھگڑا نہیں چاہتے۔ ہم اسے گرفتار کر سکتے تھے۔

مسز گاندھی انتخابی اصلاحات اور انتخابات کے دوران سرمائے کے استعمال کے خلاف بات تو کرتی ہیں، لیکن جے پی کی یہ بات نہیں مانتیں، کہ عوام کے اصرار پر قانون ساز ادارے کالعدم قرار دے دیئے جائیں۔

جے پی کے بدگو (اور ان کی تعداد کافی ہے) کہتے ہیں، کہ اس کے خیالات میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ ایک مسلم عالم اور مہاراشٹر حکومت میں سینیئر وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا کا خیال ہے، کہ جے پی کی ساری زندگی تضادات میں گزری ہے۔ امریکہ میں مارکسسٹ ہونا، بھارت میں مارکسزم کے خلاف ہو جانا، نہرو کا معترف اور پھر اینٹی نہرو، بھودان کی تحریک میں شامل

ہونا، اور پھر لاتعلق ہونا۔ گذشتہ تیس سالوں میں جے پی صرف ایک چیز پر مستقل مزاج رہا ہے، اور وہ ہے اپنی غلطیوں کا اعتراف۔ آج بھی وہ ایسا ہی ہے۔ وہ مکمل انقلاب کی بات کرتا ہے۔ مارکس اور لینن کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن ان کے خلاف بھی ہے۔ وہ فوجی ڈکٹیٹروں مثلاً پاکستان کے صدر ایوب کی تعریف بھی کرتا ہے۔ وہ حکمران جماعت کی ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ آمیزش پر تنقید کرتا ہے۔ لیکن پیکنگ نواز نکسل باڑیوں، سوشلسٹوں، جن سنگھیوں حتیٰ کہ آنند مارگ کی مدد بھی حاصل کرتا ہے۔ اس کا مکمل انقلاب کوئی معاشی لائحہ عمل نہیں بناتا۔ اس کی تحریک کانگرس کے خلاف منتشر جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے پاس بھارت کے معاشی مسائل کا کوئی حل نہیں۔ وہ جمہوریت بچاؤ کا نعرہ لگاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتا ہے، کہ سیاسی جماعتیں ختم ہونی چاہئیں۔ جے پرکاش کے لئے بہترین خطاب مسٹر کنفیوژن ہو سکتا ہے۔

اب وقت آگیا ہے، کہ ہم اپنی تمام تر توجہ مکمل انقلاب پر مرکوز کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں مسائل کے بارے میں واضح ہونا چاہیئے۔ ہمیں جے پی نرائن یا اس کے خلاف ہو کر سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ ہم اس کی تحریک کی حمایت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں ذاتی تعصب سے گریز کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی بغیر کسی وجہ کے حکمران جماعت کے خلاف ہونا چاہیئے، کیونکہ ہم بھارت کے مستقبل اور جمہوریت کے خواہاں ہیں۔

جے پی نے کانگرس اور انتظامیہ کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں، اُن میں وزن ہے۔ بدعنوانیاں تو ضرور موجود ہیں، اور حکومت نے انہیں ختم کرنے کے لئے کئی آرڈی ننس بھی جاری کئے ہیں۔ انتخابات کے دوران پارلیمنٹری یونٹوں نے عوامی تحاریک کو کچلنے کی کوشش کی ہے۔ اور کانگرس پارٹی نے انتخابات جیتنے کے لئے کالا دھن استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ کام صرف کانگرس نے ہی نہیں کئے۔ دوسری پارٹیوں نے بھی اس سے اجتناب نہیں کیا۔ حکومت سے زیادہ حزب مخالف نے قانونی اور جمہوری اداروں کو تباہ کیا ہے۔ یہ صرف اور صرف ان لوگوں کی مہربانی ہے، کہ آج ایمرجنسی قائم ہے۔ ان کے گھیراؤ، جلاؤ اور دھرنا مار کی پالیسیوں

نے حکومت کو مجبور کیا ہے، کہ وہ جمہوری طریقے کی بجائے آرڈی نینس کا سہارا لے۔

کانگرس اور حکومت دونوں جمہوریت کا گلا گھونٹنے کی ذمہ دار ہیں۔ کیرالا میں اکثریتی کیمونسٹ حکومت کا اختتام اور گجرات میں صدر راج کا نفاذ بہت بڑی حماقتیں تھیں۔ حکومت کو یہ ثابت کرنا ہوگا، کہ انتخابات آزادانہ ماحول میں ہوں گے۔ کسی کی جیت سرمائے کی طاقت پر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حزبِ اختلاف بشمول جے پی پر ہوگی۔

اگر یہ شخص صحیح طریقے سے منتخب ہو کر آتا ہے، تو پھر اسے اپنے فرائض انجام دینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جانی چاہیئے۔ اُسے جبراً ہٹانا نہیں چاہیئے، جب تک کہ اس کے ووٹ دہندگان اُسے خود نہ ہٹائیں۔ یہی جمہوریت کی بنیاد ہے، اور جے پی کی تحریک اس کی بیخ کنی میں کوشاں ہے۔

جادُو بھری آواز - رُونا لیلیٰ

ایک رات مجھے اسے سننے کا اتفاق ہوا آج بھی نصف شب کے قریب اس کے نغمے میرے کانوں میں گونجتے ہیں نغموں کی شاعری البتہ صحیح طور پر یاد نہیں ایک تو فیض احمد فیض کی شاعری تھی جس میں بادلوں اور شراب کی خواہش تھی اور پھر ہر خواہش سے بے نیازی دوسرے ایک بنگلہ لوک گیت تھا جس میں عاشق قسمیں کھا کر محبوبہ سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ آخری گیت ایک ملتانی گیت تھا جس کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہ آیا لیکن اس گیت نے سب سے زیادہ لطف دیا۔ کومیر اجیت سیٹھی درست کہتا ہے کہ رونا کو کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی سننا چاہیئے۔ اس کی خوبصورت آواز اداس چہرہ اور مترنم ادائیگی نے میری نیند تباہ کر دی۔ وہ کون پاپی تھا جس نے اس کی مسکراہٹیں اداس کر دی تھیں۔ یہ میں ہی تھا جیسا کہ ڈاؤسن نے کہا — پرانے جذبوں کا اسیر — آج کی رات اس خوبصورت شرابی مترنم آواز اور بنگلہ دیش کی حسینہ کے نام تھی۔

پردہ اٹھنے سے پہلے مجھے چند لمحے رونا لیلیٰ کی والدہ بیگم سید امداد علی سے گفتگو کے لیے مل گئے ان پانچ منٹوں میں اپنی بیٹی کے مستقبل سے زیادہ وہ اپنے خاندان کی عزت و توقیر کے متعلق گفتگو کرتی رہی (میاں امداد چٹا گانگ ہل کسٹم آفیسر ہیں) رونا۔ دراصل ارونا لیلیٰ ۲۲ سال قبل سلہٹ میں پیدا ہوئی گویا پیدائشی طور پر وہ ہندوستانی ہے اس کے باپ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ خاندان ملتان جا کر آباد ہو تمام زبانیں رونا لیلیٰ نے موسیقی کے ذریعے سیکھیں۔ وہ ایک رقاصہ بننا چاہتی تھی لیکن آل پاکستان میوزک کونسٹ میں اس نے پہلا انعام حاصل کیا تو پھر اس کی توجہ موسیقی کی طرف ہو گئی۔ اس نے استاد کا دھو بالی سے تربیت حاصل کی۔ موسیقی کے مقابلوں سے فلموں

تک اور پھر فلموں سے سٹیج شو تک اس نے بنگالی، پنجابی، ملتانی، پشتو، سندھی، اُردو اور ہندی کے تقریباً تین ہزار نغمات ریکارڈ کروائے ہیں، اب وہ لتا، آشا اور کشور کی طرح اعلیٰ ترین معاوضہ وصول کرتی ہے۔ بمبئی کے ایک پروگرام میں اسے چودہ ہزار روپے پیش کئے گئے سامعین کی اس حوصلہ افزائی سے وہ اس معاوضے کو دوگنا بھی کر سکتی ہے سٹیج پر اس جیسی پذیرائی ہمارے اور کسی گلوکار کے نصیب میں نہیں، اور اس کے ہاتھ میں دوسرے گلوکاروں کی مانند کبھی کوئی نوٹ بک نہیں دیکھی گئی۔

لتا منگیشکر اور آشا بھوسلے کے ساتھ ساتھ اُسے بھی شمار کیا جاتا ہے یہ تینوں اپنے اپنے لحاظ سے عظیم ہیں۔ لتا اور آشا کے پرستار دور دراز تک موجود ہیں اور وہ ہم کلاسیکل موسیقی میں ابھی تک سرفہرست ہیں لیکن رونا کی گہری آواز اور ادائیگی کا انداز جانے آیندہ دس سالوں میں فلمی گلوکاری میں سرفہرست رکھے گا۔

بنگلہ دیش اور پاکستان رونا لیلیٰ کے فن کے لیے بہت چھوٹے علاقے ہیں۔ اس کے مستقبل کا ملک بھارت ہے اور صرف بھارت ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھارتی میں کسی پاکستانی ہائی کمشنر نے کہا تھا کہ ہم سے کشمیر لے لو اور ہمیں لتا دے دو میں بنگلہ دیش سے کہتا ہوں کہ فرخا بیراج کا سارا پانی لے لو اور رونا لیلیٰ ہمیں دے دو

ہیرلڈ میکملن

رات کے کھانے کی دعوت ساڑھے سات بجے ہے ہمارے مہمان خصوصی کی عمر ۶۳ سال ہے اور وہ زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتے۔ وہ ایک گھنٹہ دیر سے آیا ہے شاید اس لیے کہ وہ شراب نہیں پیتا اور دوسروں کو موقع دیا ہے کہ وہ کھانے سے پہلے کچھ پی پلا لیں۔ وہ گہرے رنگ کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس ہے اور اس کے ہاتھ میں بڑی سمارٹ سی بید کی چھڑی ہے جس پہ ایک سلور کی پلیٹ لگی ہے جس پر ان لوگوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اسے یہ تحفہ دیا ہے۔ اس نے کچھ محنت کی ہے اور ہم سب کے متعلق جانتا ہے۔

"اوہو۔ مسٹر پاکی والا۔ آئین پر آپ کی بحث کیسی جا رہی ہے؟"

"مسٹر بیسانی۔ سنسر شپ کے بارے میں آپ کا فیصلہ میں نے پڑھا تھا۔"

آنند۔ ! تم بڑے ناول لکھتے ہو۔ لیکن افسوس ہمیں نہیں دیتے۔

مکشن۔ ! تم وکی اور لو کو جانتے ہو گے۔ وہ بہت اچھے اور دلچسپ ٹورنسٹ تھے

وہ ایک آرام دہ کرسی میں دھنس جاتا ہے اور اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیتا ہے وہ بالکل اپنے کارٹون کے مطابق نظر آنے لگتا ہے جو لوگوں نے اس کے متعلق بنائے ہیں اس کی آنکھیں جینیوں کی مانند ہیں صرف باتیں کرتے ہوئے کھلی نظر آتی ہیں باقی اوقات میں وہ سویا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی مونچھیں بہت اور بہت فوجی اپر کلاس کی طرح ہے۔ کیا ؟ اچھا ! ہاں۔ سکاچ، سوڈا ملا کر شکریہ۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

ہم اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ ایمرجنسی یا اندرا گاندھی کے بارے میں کچھ

نہیں کہے گا۔ یہ مناسب نہیں۔ چرچل نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی سیاسی بیان نہیں دیا اور چرچل ایک دلچسپ وزیراعظم تھا۔ اس لیے ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں "آپ کے زمانے میں مشہور مقرر کون کون تھے ۔" وہ بہت کم جواب دیتا ہے۔ وہ اپنا کوٹا ختم کر چکا ہے اور ۲/۱ ۹ بجنے والے ہیں اس لیے ہم ڈنر کی میز کی طرف چل دیتے ہیں۔ وہ میرے سامنے والی میز پر بیٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں پالکی والا سے اس کی گفتگو نہیں سن پاتا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہر پانچ چھ منٹ کے بعد وہ اپنی میزبان مسز پیٹرز کی طرف مڑ کر اطمینان کر لیتا ہے کہ وہ قریب ہی بیٹھی اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ سوپ کے دوران شیری کے گھونٹ بھی لیتا ہے کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں کافی یا شراب کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں وہ تھوڑی سی برانڈی لیتا ہے۔ اور ہوانا نامی سگار سلگا لیتا ہے۔

"تم مجھ سے اچھے مقرروں کی بابت پوچھ رہے تھے ۔" وہ گفتگو کا ٹوٹا سلسلہ جوڑتا ہے ۔ "ہاں تو چرچل ۔ اس کی تمام تقاریر مجھے ازبر ہیں۔ اینورن بیون بھی اچھا تھا۔ ارنسٹ بیون بھی کام کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی لائڈ جارج اور اس کو تھد کا ہم پلہ نہیں تھا۔ جب میں نے پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کی تو میرا خیال تھا کہ میں نے بڑا کام دکھایا ہے۔ لائڈ جارج نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ تمہاری تقریر تو اچھی تھی لیکن عوام میں سے کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے گا تم نے بیس نکات پیش کیے۔ اچھا ہوتا اگر تم ایک ہی نقطہ بیان کرتے۔ ہر ممبر کو دوسرے ممبر سے ہی توقع ہوتی ہے۔ دو وزیر کابینہ کی طرف سے اور تین وزیراعظم کی طرف سے اور بس ۔"

وہ اپنے تبصرے پر خوش نظر آتا ہے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے گویا نیند کی وادی میں جا چکا ہے جب ساقی اس کا گلاس لینے آتا ہے تو وہ مزید شراب کے لیے گلاس آگے کر دیتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں پر آتے ہیں جو اس سے مل چکے ہیں "جناح اسی گرم مکان میں اسی کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت

قابل مقرر تھا۔ اور وہ وِدر اِد کیل۔ تمہیں شاید نام یاد ہو۔ ڈلیبائی ہاں۔ بھولا بھائی وہ بھی بہت اچھا تھا۔"

وائس چانسلر صاحب ایک اور نام سری نواس شاستری۔ بھارت کا بہترین مقرر یاد دلاتے ہیں۔ مسٹر میکملن آنکھیں اٹھاتا ہے اور جوابا کہتا ہے

"ہاں ۔ او مولڈ موزے ۔ میں یاد دلاتا ہوں ۔" ہاں ۔ ہوشیار لڑکا تھا۔ لیکن وہ شہریت حاصل کرنے میں جلد بازی کرتا تھا۔ پارٹی لیڈر بننے سے پہلے میں نے ۱۰ سال آخری بنچوں پر گذارے ۔ سیاست میں صبر بہت ضروری ہے"

"انوک پاول" کوئی یاد دلاتا ہے۔ لیکن مسٹر میکملن اپنے خالی گلاس سے اسے نامنظور کر دیتا ہے۔ گلاس دوبارہ بھرا جا چکا ہے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ فریڈی ہستہ اندر آتا ہے اور شوشہ چھوڑتا ہے ۔ "سر آپ کب تک بیٹھیں گے ۔"؟

"میں ۔ دو بجے سے پہلے تک ۔"

ہم ناخوش خبریں ملاتے ہیں "پھر تو آپ صبح دیر سے اٹھیں گے ۔"

"نہیں میں سات بجے اٹھ جاتا ہوں ۔ مجھے زیادہ نیند کی عادت نہیں۔"

پس ہم برطانوی سیاست۔ بھارت کے لیے اس کی محبت اور میکملن کے گھر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ آدھی رات ہونے والی ہے۔ پھر برطانیہ کا سابق وزیراعظم تشویش کا اظہار کرتا ہے۔

"آپ میں سے بہت سے لوگ جانا چاہتے ہوں گے ۔"

مہمان بادِل نخواستہ اُٹھتے ہیں "آپ سے مل کر نہایت ہی خوشی ظاہر ہوئی سر" مہمان کہتے ہیں ۔

"سر نہیں ۔ وزیراعظم کے لیے خطاب حاصل کرنا بہتر نہیں ہوتا معلوم نہیں چرچل نے اسے کیسے قبول کیا اور ایٹلی نے بھی ۔"

اس سے پہلے وہ خطاب قبول کرنے یا نہ کرنے کی بحث چھیڑتا ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے

آندری مال راکس۔ دھماکہ خیز قوت

ایک عظیم ادبی شخصیت اور ہمہ وقت انقلابی ــــ پیرس میں حال ہی میں موت سے دوچار ہونے والا آندری فرانس کے ادب اور سیاست پر چھایا ہوا تھا۔ وہ صدر ڈیگال کا نظریہ ساز، اور پوری دنیا میں استحصال کا مخالف تھا۔ اس نے چین کے انقلابی کیمونسٹوں کا ساتھ نبھایا، سپین کی سول وار میں حصہ لیا۔ جنگِ عظیم دوم میں فرانسیسی مزاحمت میں شمولیت کی، اور بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی میں مدد کی۔

بین الاقوامی واقفیت عامہ کی بنا پر ۱۹۷۲ء میں اسے نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں جب یہ ایوارڈ وصول کرنے بھارت آیا، تو میں نے اس کا انٹرویو لیا۔

ایرک ایرکسن نے اپنی کتاب گاندھی کی سچائیاں میں کہیں لکھا ہے، کہ تحریر سے کہیں زیادہ اہم دو چیزیں ہیں ــــ عمل اور خاموشی ــــ آندری تحریر اور عمل میں یقین رکھتا ہے، لیکن خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنے عمل سے جانا جاتا ہے، وہ کہتا۔ اس کے ہیرو باعمل لوگ تھے، ماؤزے تنگ، ڈیگال، لارنس آف عریبیا۔ اس نے نہ صرف ان لوگوں کے متعلق تحریر کیا، بلکہ اپنی زندگی کے بھرپور سال عملی جدوجہد میں گزارے، جہاں وہ موت سے کئی بار بال بال بچا۔ اگرچہ اس نے اپنے بارے میں کچھ بات نہیں بتائی، تاہم وہ ہر جگہ مقبول تھا۔

مال راکس کے خاندان کا تعلق فلینڈرز سے تھا۔ اس کا باپ شراب اور مچھلی کا سوداگر تھا۔ ۱۹۰۱ء میں آندری کی پیدائش ہوئی۔ آندری کے باپ نے دو دھارے کلہاڑے سے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔ اس کی پیدائش کے چار سال بعد اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی، اور وہ اپنی ماں

کے ساتھ رہنے لگا، جو سبزی کی دوکان کرتی تھی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس سے اسے دو بیٹے ہوئے، اور پھر اس نے خودکشی کر لی۔ آندری کہتا ہے: میں جانتا ہوں کہ تمام ادیب اپنے بچپن سے محبت کرتے ہیں، مگر میں نفرت کرتا ہوں ــــ

آندری کی تعلیم کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ اور جو کچھ اس نے خود تحریر کیا ہے، وہ بہت معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم ۱۹۲۰ء میں وہ دریائے سین کے کنارے کتب بیچا کرتا تھا۔ وہ ماہنامہ اور ہفت روزوں میں آرٹ پر مضمون لکھا کرتا تھا۔ اس نے ایک مالدار یہودی دوشیزہ کلارا گولڈ سمتھ سے شادی کی، جس نے طلاق کے بعد اپنے شوہر کی سوانح حیات لکھی۔

آندری نے اپنی بیوی کی دولت سٹاک ایکسچینج میں لگا دی۔ کوئی روزگار حاصل کرنے کی بجائے وہ قدیم فنون اور لٹریچر یات کا مطالعہ کرتا رہا۔ جب کبھی اس کی یہودی بیوی شکایت کرتی، تو وہ کہتا آہ و زاری اور چیخنا چلانا تمہاری فطرت بن چکا ہے ــــ

۱۹۲۳ء میں آندری نے پیرس کے ایک تعلیمی ادارے سے قدیم زبانوں کا ایک کورس کیا، اور اپنی بیوی اور دوست کے ساتھ کمبوڈیا چلا گیا۔ کمبوڈیا میں اپنے قیام کے دوران دونوں دوست انکور واٹ کے ساحل کے قریب ایک علاقے میں گئے، اور ایک نادر بدھ مندر لوٹا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مال راکس کو تین سال قید ہوئی۔ اپیل کے نتیجے میں یہ دو سال میں تبدیل ہو گئی۔ اور پھر اس کی بیوی اور دوسرے دانشوروں کی پریس میں تحریک کے نتیجہ میں ختم ہو گئی۔ ممنونِ احسان آندری فرانس واپس آیا۔ مگر اپنی بیوی کے لئے تحفے کے طور پر حشیش لایا۔

ایک سال بعد مال راکس بھارت کے چینی علاقے میں واپس آیا، تاکہ حکومت کے ساتھ اپنے جھگڑے نمٹا سکے۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کا معاون رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا نام [illegible] جرنل تھا۔ انتظامیہ نے اس پرچہ کو دبانا چاہا۔ مال راکس نے جواباً ایک کتاب لکھ دی جو مغرب کی ترغیب،، اس میں اس نے نوآبادیاتی نظام کے بخیے ادھیڑ دیے، اور قدیم ثقافت کی تعریف کی۔ دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں اس نے اپنا پہلا ناول ”فاتحین،، مکمل کیا۔ اس میں ۱۹۲۵ء کے فوجی [illegible]

کا ذکر تھا۔ وہ گیلی مارڈ کے باعزت گروہ میں شمار ہونے لگا، اور آندری گائیڈ کا قریبی دوست بن گیا۔ کام کے دوران اُس نے ایران، افغانستان، بھارت، ملائشیا اور چین کا بھی دورہ کیا۔

چین میں اُس کے ناول "انسان کی قسمت"، کو فرانس کے نوبل انعام کے برابر پرکس گون کورٹ انعام ملا۔ ناول کے کرداروں میں اس کی بیوی کلارا بھی ہے۔ جس نے اپنی بے حیائی کا بھی اعتراف کیا، اور ۱۹۳۶ء میں طلاق حاصل کی۔

انعام کی رقم اور کتابوں کی رائیلٹی نے آندری کو اس قابل بنایا، کہ وہ ملکِ عرب جا کر ملکہ شیبا کا شہر تلاش کرے۔ اُس نے اپنی دریافتوں کے متعلق بڑے پُرجوش خط لکھے، جن سے اُس کی تصوراتی دنیا کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۹۳۰ء کے دہاکے میں مالراکس کی صلاحیتیں یورپ میں بڑھتے ہوئے فاشزم کے خلاف جمع ہو گئیں۔ ری سٹاگ میں آگ کی واردات میں دمتری کو بچانے کے لیے آندری اور گائیڈ نے مل کر کام کیا۔ اس کا چوتھا ناول "ڈیز آف ورتھ"، نازیوں کے اذیتی کیمپوں کے بارے میں ہے۔ پھر وہ سپین چلا گیا، جہاں خانہ جنگی پھوٹ چکی تھی۔ اُس نے فرانکو فاشسٹوں کے خلاف سپین کی ایئر فورس کو منظم کیا۔ وہاں اُس نے اپنے ہم نسلوں ہیمنگ وے، ڈان پاسوس، نرودا اور ایلیا اہرن برگ سے ملاقاتیں کیں۔ اہرن برگ نے مالراکس کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی جذبے کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔

مالراکس نے سپینی زبان میں بیٹھ کہانیاں تحریر کیں۔ پھر اس نے اس تجربے کو ایک فلم کی صورت میں ڈھالا۔ اُس نے جو فلم بنائی، اُس کا نام "لا اسپائیر"، یعنی "اُمید"، تھا۔ اُس کا خیال تھا، کہ سپین کا انقلاب اُمید کا ہی اظہار تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے تین سال بعد اس کی پہلی بیوی کلارا نے اُسے طلاق دے دی، تو مالراکس نے جوسے کلاٹس نامی ایک ٹیچر سے شادی کر لی۔ دونوں فرمانبردار سپین کے کاز کی خاطر ریاست ہائے متحدہ امریکہ روانہ ہوئے۔ فرانکو جیت گیا۔ اور دوسری جنگِ عظیم نے ناگزیر حیثیت اختیار کر لی۔

مالراکس کے مطابق فاشزم کا مطلب شیطان کی واپسی تھا۔ وہ خفیہ طور پر جنگ میں شامل ہوا۔ جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ لیکن جیل سے بھاگ کر فرانس کے جنوبی علاقے میں اپنی بیوی سے جا ملا۔ اُس کا ناول "دی والنٹ ٹریز آف ایلٹن برگ"، فاتح جرمنوں کے ذہنی انقلاب کے بارے میں ہے۔ یہ تبدیلی جرمنوں میں اُس وقت آئی، جب وہ گیس کو بطور ہتھیار استعمال کر چکے تھے۔ جب فرانس کو شکست ہوئی، تو مالراکس ماکوئیس کی مزاحمتی تحریک میں شامل ہو گیا۔ جرمنوں کے ساتھ ایک مقابلے میں اس کا ڈرائیور مارا گیا، اور وہ خود زخمی حالت سمیت قید ہو گیا، اور اسے موت کی سزا سُنائی گئی۔ اُسے ایک فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، جس نے اس پر خالی فائر کیے۔ اپنے اس تجربے کو اس نے اپنی کتاب "اینٹی میموریز" میں بیان کیا ہے۔

جب جرمن چلے گئے، تو وہ جیل سے رہا ہوا، اور باہر آتے ہی اُس نے مارکوئیس کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ آندری مالراکس اپنے دو سوتیلے بھائیوں کو کھو کر "آزادی کا کراس"، اور "کروشے ڈی گیرے"، حاصل کر چکا تھا۔ ایک شدید المیہ ابھی باقی تھا۔ ۱۹۴۴ء میں دو بیٹوں کو جنم دینے والی جوسے کلاٹس ایک ریل حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

جنگِ عظیم کے اختتام پر مالراکس کا انقلابی جوش و جذبہ سرد پڑ گیا۔ اُس نے جنرل ڈیگال کی عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی۔ بعد میں اُس نے وضاحت کی، کہ اُس کے جوانی کے نظریات اور موجودہ نظریات میں بڑا فرق ہے۔ "میں نے پرولتاریہ کو فرانس سے بدل لیا ہے"۔ اُس نے کہا۔ کمیساروں کی بجائے کارسیاگیوں کو ترجیح دی۔ ڈیگال کی صورت میں اُسے جنگِ آزادی کے ہیرو اور نوآبادیات کے خلاف ایک شخص کی سی شخصیت ملی۔ اس کے نزدیک ڈیگال ازم کا مطلب فرانس کی خدمت تھا۔ جنرل ڈیگال نے بھی مالراکس کو اپنا دایاں ہاتھ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈیگال کے بقول مالراکس کی موجودگی اُسے ہر مشکل سے بچاتی تھی۔

ڈیگال کی ریٹائرمنٹ کے دوران مالراکس نے "وائیس اور سائی لینس"، "امیجز ی بروکن اور میٹا مارفسس آف گاڈز" مکمل کیں۔ ۱۹۵۸ء کے موسمِ بہار میں جب ڈیگال پھر برسرِ اقتدار آیا، تو مالراکس اُس کی حکومت میں ثقافتی امُور کا وزیر بن گیا۔ جنرل اور اس کے ساتھی دانشور نے الجزائر سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کرنے کی تدابیر کیں۔ فرانسیسی فاشسٹوں کے ہاتھوں مالراکس پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ لیکن وہ محفوظ رہا۔

اپنے ملک کی ثقافتی حالت کو آندرے مالراکس سے زیادہ بہتر کسی وزیرِ ثقافت نے نہیں بنایا۔ اُس نے پیرس کے چہرے سے میل اور کالک اُتار کر اُسے ہیرے کی طرح چمکا دیا۔ اس نے فوجی تھیٹروں کی تنظیمِ نو کی، اور دُنیا بھر میں خیرسگالی دوروں پر گیا۔ وہ گیارہ سال تک وزیر رہا۔

موت کُتّے کی طرح مالراکس کے قدم سونگھ رہی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں اُس کے دونوں بیٹے اذیت ناک موت کا شکار ہوئے۔ اس کی دوسری شادی جو اس نے اپنے سوتیلے بھائی کی بیوہ سے کی تھی، علیحدگی پر ختم ہوئی۔ دل بہلانے کی خاطر اُس نے مصر، بھارت اور چین کا بحری سفر کیا۔

مالراکس کے اندر سلگتی آگ، بیماری، طویل عمری، شکستہ رشتوں اور ذاتی المیوں کے باوجود کم نہ ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں سیپٹینی (عہدِ عتیق کا یونانی نام اُن لوگوں کے لیے جو قدیم عہدنامہ کو مانتے ہیں) مالراکس نے پاکستانی فوجوں کے تشدد کی مذمت کی، اور بنگلہ دیش کے آزادی کے جیالوں کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔

میری مالراکس سے ۱۹۷۴ء میں کلکتہ میں مُلاقات ہوئی، جب وہ نہرو ایوارڈ حاصل کرنے آیا۔ یہ انٹرویو بمبئی کے گورنر نواب علی یاور جنگ اور فرانسیسی سفیر مسٹر جین ڈینیل جرگنسن کی کوششوں سے طے ہوا۔ میں اُس سے ملنے میں ہچکچاتا تھا۔ ایک تو میں نے مالراکس کا مطالعہ بہت کم کیا تھا اور دوسرے مجھے علم تھا کہ تمام فرانسیسی دانشوروں کی طرح وہ بھی فرانسیسی میں ہی گفتگو کرتا ہے۔

موت کے ساتھ اس کے بے شمار تصادم میرے ذہن میں تھے۔ اس کی یہودی بیوی کی

بے وفائی، اور بعض عورتوں سے ساتھ اس کے مراسم (یہ بھی معلوم ہوا تھا، کہ ۱۹۷۲ء میں اُس نے ایک مالدار وارثہ سے شادی کی تھی) کی خبریں بھی تھیں۔ لیکن بھارت میں اُس کی ہم سفر ایک نوجوان خاتون تھی۔ میں اُس کی عظیم شہرت سے بھی متاثر تھا۔ میں گھبرایا گھبرایا سا راج بھون میں داخل ہوا۔ انٹرویو کے وقت جو خوداعتمادی عموماً میرے اندر موجود ہوتی ہے، مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔

مالراکس کا چہرہ اُس کی جوانی کی یادگاریں لیے ہوئے تھا، اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ کھنچا ہوا لگتا تھا۔ وہ بہت تیز بولتا تھا، اور اس کی زبان گڑبڑا جاتی تھی۔ مجھے بات سمجھنے کے لیے اکثر سفیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا تھا۔ اس عظیم انسان کے ساتھ جو گفتگو ہوئی، اس کا مختصر حال کچھ یوں ہے:

سوال:۔ آندرے گائیڈ نے ایک جگہ لکھا ہے، کہ ادیب و شاعر ہمیشہ زندگی اور موت کے مسائل میں اُلجھے رہے ہیں۔ آپ کی اپنی زندگی میں موت کی بہت سی ستم ظریفیاں رہی ہیں اور آپ نے ایک خطرناک زندگی گذاری ہے۔ میں اس فلسفۂ موت کے متعلق آپ کا نظریہ جاننا چاہتا ہوں۔ ہندوؤں کا نظریہ کچھ اور ہے، اور عیسائیوں کا کچھ اور۔ یعنی ہندو زندگی، موت اور دوبارہ زندگی یعنی آواگون پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آپ یقیناً نہیں رکھتے ہوں گے؟

جواب:۔ میری بہت سی تحریروں میں موت بحیثیت ایک مضمون کے آئی ہے۔ لیکن جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے، کہ حیات بعد الموت کے بارے میرا کیا خیال ہے، تو میں جواب دیتا ہوں، کہ میں اس سوال کو فلسفیانہ طور پر سمجھ نہیں پاتا۔ اگر میں اپنے آپ کو مذہبی لوگوں میں شمار کروں، تو میں سوال کو پوری طرح سمجھ لیتا ہوں۔ بصورتِ دیگر گفتگو بے معنی ہے۔ ہم عیسائیوں سے نہیں پوچھتے، کہ کیا وہ زندگی کو دائمی سمجھتے ہیں۔ اگر مذہبی لوگوں سے پوچھا جائے تو یہ نظریہ جیسا کہ میں نے اپنی آخری کتاب میں بیان کیا ہے، لاحاصل ہے۔ ہمارا سوال ہونا چاہیئے، کہ حیات بعد الموت اور تاحیات بعد الموت میں کیا فرق ہے۔ تناسخ یا عدمِ تناسخ میں کیا فرق ہے۔ میں تناسخ میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ جو کچھ اس زندگی سے باہر ہے، یعنی جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اصل میں ہمارے خیالات اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ہاں

اتنا ضرور کہوں گا، کہ میں رُوحوں کے تناسخ کا قائل ہُوں۔ اور یہ نہایت مدلّل بات ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے، کہ وہ مذہب سے الگ ہو کر حیات بعد الموت کا قائل ہے، تو وہ بیوقوف ہے۔

سوال:۔ آپ موت کے اتنا قریب رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، کہ آپ نے موت پر کیسے قابو پایا؟

جواب:۔ یہ میری پچیس سالہ ریاضت کا نتیجہ ہے۔ اس عرصے کے دوران موت مجھ پر اتنی دفعہ حملہ آور ہُوئی، کہ مجھے اس کی آمد پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ موت کا خوف۔ میں اسے ایک اور طریقے سے واضح کرتا ہُوں۔ موت کے نظریئے کی دو پرتیں ہیں۔ ایک تو طبعی طور پر مر جانا ہے۔ دوسری موت کی، بعد الطبیعات۔ میں موت کے بعد الطبیعاتی، نظریئے پر سوچ بچار کرتا ہُوں۔ لیکن اپنے طبعی انجام سے بالکل لاپرواہ ہُوں

سوال:۔ موت میرے قریب سے کبھی نہیں گذری۔ پھر بھی میں اس سے خوفزدہ ہُوں لیکن آپ ایک ادیب ہیں، اور پھر موت کا تجربہ بھی آپ کو ہے۔ کیا آپ بتائیں گے، کہ آپ موت سے کیوں خوفزدہ نہیں، جبکہ میں ہُوں؟

جواب:۔ مذہبی اعتقاد کی بنیاد پر تناسخ کا قائل ہو جانے اور مغرب کے نظریۂ پرواز روح سے ذہنی سکون حاصل کر لینے میں فرق ہمارے سامنے ہونا چاہیئے۔ مغربی سائی کاٹرسٹ کہتے ہیں، کہ انسان غیر شعوری طور پر اس بات پر یقین رکھتا ہے، کہ مرنے کے بعد وہ لاشوں کی صورت میں ہوں گے۔ یہی وجہ ان کے لیئے موت کا خوف پیدا کرتی ہے۔

سوال:۔ کسی نامعلوم ہستی کا خوف تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہے؟

جواب:۔ یہ ذہنی کوفت کا نظریہ ہے۔ جسے سیرک گارڈ نے پیش کیا، اور اسے خدا کے مقابلے میں رکھا۔ لیکن میرا ذاتی نظریہ ہے، کہ ذہنی کوفت نامی چیز خالصتاً مابعد الطبیعاتی نہیں ہے۔ ذہنی کوفت کا باعث خارجی عناصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب پر اعتقاد

یہ سوچنا، کہ مرنے کے بعد ہم لاش میں تبدیل ہو جائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرا خیال نہیں سترھویں صدی کے ہندوستانی موت سے ذہنی طور پر خوفزدہ تھے، اور نہ ہی قدیم روم کے باشندے ایسا سوچتے تھے۔

سوال:۔ یہ صرف موت کا ہی خوف نہیں، بلکہ موت کے خوف کے ساتھ ساتھ تکلیف کا خوف بھی مجھے پریشان کرتا ہے؟

جواب:۔ یہ ایک الگ سوال ہے۔ ایک پہلو ایسا ہے، جس میں مجھے کوئی تجربہ حاصل نہیں ہُوا، اور وہ ہے تکالیف۔ موت کے تازہ ترین حملے میں بھی مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہُوا۔ میں کئی دفعہ زخمی ہُوا ہُوں۔ لیکن زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ کبھی میرے معدے میں گولی نہیں لگی۔ بازو نہیں ٹوٹا۔ میں نے کئی جگہ پڑھا ہے، کہ تکالیف موت کا عروج ہیں لیکن میں ایسے کسی تجربے سے نہیں گذرا۔

سوال: آپ کی ساری زندگی اس امر کی گواہی دیتی ہے، کہ آپ نے ڈرائنگ روم کی نسبت انقلابی جدوجہد میں زیادہ آرام محسوس کیا ہے۔ آپ نے اپنی کئی تحریروں میں اس حوالہ بھی دیا ہے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟

جواب:۔ حقیقی طور پر تو انقلابی تحریکات نہیں ہیں۔ گو ہر ایک طرح کی انقلابی شخصیات ضرور موجود ہیں۔ تمہارے ملک میں انقلاب آزادی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس وقت حقیقتاً آپ انقلابی تحریک چلا رہے تھے۔ اب روس میں جو تبدیلی آئی، اُسے انقلابی تحریک کا نتیجہ کہا تو جا سکتا ہے۔ لیکن برزنیف اور لینن کے اقوال میں بہت زیادہ فرق ہے۔ بھارت میں کانگرس اب وہ قوت نہیں رہی، جو گاندھی کے جیل جانے کے دوران تھی۔

سوال:۔ میرے خیال میں دنیا کی آئندہ جنگ نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہو گی۔ جیسا کہ جنوبی افریقہ میں کالوں اور گوروں کے درمیان ہُوا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا انقلاب ہے۔ کچلے ہُوئے کالے لوگوں گا۔ آپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

جواب :۔ میرے خیال میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اقوام اس مسئلے سے باخبر ہیں۔ اور اس قسم کے حادثے سے پہلے ہی کوئی تدبیر سوچ لیں گی۔ ہو سکتا ہے، کہ تیسری دنیا اور سرمایہ داری میں کوئی مفاہمت ہو جائے۔ مثلاً وہ یہی سوچ لیں، کہ پٹرول کے موجودہ ذخائر صرف بیس سال تک پیداوار کے قابل ہیں۔ تبدیلی ضرور آئے گی، اور اسے آنا چاہیئے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ بڑی طاقتیں جانتی ہیں، کہ موجودہ نظام غلط ہے۔ لیکن اس میں تبدیلی لانے کے لئے ان کے پاس اٹھارہویں صدی کی جمہوری روایات کے علاوہ کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے، کہ آیا ہم نئے طریقے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہی اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

انقلابی دھارے کے نظریہ کو بھی رد نہیں کرتا۔ یہ ہو سکتا ہے، کل جنوبی افریقہ میں لاکھوں ہزاروں اموات ہو جائیں۔ بیافرا میں بھی لاکھوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ بنگلہ دیش میں بھی۔ مگر ان لاکھوں افراد کے مار دیئے جانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ مغرب جس نے سائنس کی ترقی کی بدولت دنیا پر فتح حاصل کی، دنیا کو درست رکھنے کے لئے کوئی نظریہ نہیں رکھتا۔ مغرب صرف اقوام متحدہ کے ذریعے دنیا کے ممالک کو متحد رکھنے کے نظریئے پر اڑا ہوا ہے۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق یہ سراسر حماقت ہے۔

سوال :۔ کیا آپ گذشتہ سال کے اپنے بیان کی وضاحت کریں گے۔ جس میں آپ نے کہا تھا، کہ بھارت اور چین کے درمیان اقتصادی ترقی کے میدان میں اختلافات شدید تر ہو جائیں گے؟

جواب :۔ ماؤزے تنگ کی موت کے بعد اہم تبدیلیاں ہوں گی۔ لینن کی موت کے بعد روس میں تبدیلی آئی۔ ترد یگا اور ٹراٹسکی کے بعد کیا ہوا۔ میں نہیں جانتا، کہ ڈ کے بعد چین میں کیا ہوگا۔ لیکن تبدیلی ضرور آئے گی۔ اس سے زیادہ میں بھارت اور چین کے تعلقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔

سوال :۔ آپ نے ایک نہایت خوبصورت بات کی، کہ ہر کسی کو دنیا میں ایک مثال چھوڑ جانی چاہیئے۔ آپ کے خیال میں آپ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟

جواب :۔ میں نے اپنے بارے میں یہ تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میرے ناول "دی ہیومن کنڈیشن" میں ایک کردار نے کہا تھا۔

سوال :۔ میرا خیال تھا، کہ یہ آپ کا فلسفہ ہے۔ ادیب دوسرے کے ذریعے ہی اپنا ما فی الضمیر بیان کرتے ہیں؟

جواب :۔ یہ درست ہے، مگر وہ کردار ۱۹۳۳ء کا کردار تھا۔

سوال :۔ اس کا آپ کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟

جواب :۔ ۱۹۳۳ء میں جب میں نے یہ لکھا، تو اس وقت میرے سامنے ہٹلر تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے، کہ اس وقت جو لکھا گیا، اس کے پیش نظر فاشزم تھا۔ میں کمیونسٹ نہیں تھا۔ اور نہ ہی بائیں بازو کے اتحاد کا انحصار کمیونزم پر تھا۔ درحقیقت یہ فاشزم کے خلاف اتحاد تھا۔ اب چونکہ فاشزم نہیں ہے، اس لئے سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔

سوال :۔ اس کے باوجود کیا اب آپ یہ نہیں چاہتے کہ دنیا میں کچھ یادگار چھوڑ جائیں؟

جواب :۔ یقیناً۔ لیکن ویسا نہیں۔ ایک وقت تھا، جب عظیم لوگ ایسا کرتے تھے۔ مگر جنگ کے بغیر تو شاید چرچل بھی ایک بے کیف شخصیت ہوتا۔ جنگ کے بغیر تو شاید جنرل ڈیگال بھی ایک عام جرنیل ہوتا۔ اور ہٹلر صرف ایک احتجاج کنندہ ہوتا۔ ہمارا زمانہ جنوں کا زمانہ تھا۔ مگر انہیں جن جنگ نے بنایا تھا۔ اب ان کا نشان بھی نہیں۔ یادگار چھوڑ جانے کا نظریہ اب محض انگلی کٹوانے کی بات ہے۔ اور اس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

سوال :۔ ایرک ایرکسن نے گاندھی جی کے بارے ایک کتاب لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے، کہ صرف دو چیزیں اہم ہیں۔ عمل اور خاموشی۔ آپ اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟

جواب :۔ میرا خیال ہے، کہ اس بڑے بیان کے اندر کچھ نہیں۔ ہیر پھیر کر مطلب نکلتا ہے،

کہ خاموشی اور عمل، تحریر سے زیادہ اہم ہیں۔ مگر میرا سوال ہے، کہ کیسی خاموشی؟ کیسا عمل؟ کیسی تحریر؟ جب عمل کرنے والا سکندرِ اعظم ہے، تو عمل عظیم ہے۔ جب اس پر فتوحات کا دورہ پڑتا ہے، تو وہ لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ خاموشی ۔۔ خاموشی تو پیرا مبادکی ہے۔ لیکن اگر خاموشی بچے کی سی ہو، تو پھر؟

سوال:۔ میں آپ کی تحریروں کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ ہاتھ سے لکھتے ہیں، یا ٹائپ کرتے ہیں، یا اپنا مسودہ ڈکٹیٹ کرواتے ہیں۔ اور کیا لکھنے کے بعد نظرِ ثانی بھی کرتے ہیں؟

جواب:۔ نہیں۔ میں ڈکٹیٹ نہیں کرواتا۔ میں اپنے کام پر بہت زیادہ نظرِ ثانی کرتا ہوں۔ خاص طور پر مکالموں میں۔ اس لحاظ سے ANTIMEMORIES بہت مشکل کتاب تھی۔ مثلاً نہرو کے ساتھ گفتگو کو بیان کرتے ہوئے میں نے اس کردار کے اصل الفاظ لکھ دینا تھے۔ بصورتِ دیگر وہ میرے اندازِ گفتگو سے مشابہہ ہوتے۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا، کہ میں اس کی باتیں غور سے سنوں۔ پھر یہ بھی، کہ میں تلفظ کی صحت کا خیال رکھوں۔ اور صرف نقل ہی نہ کروں۔ اس سب کے لئے محتاط نظرِ ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے، کہ سپین کی خانہ جنگی پر آپ کا ناول ایک مہینے میں مکمل ہو گیا تھا؟

جواب:۔ یہ واقعی سب سے کم عرصہ میں لکھا گیا۔ مگر پھر بھی پانچ ماہ سے اُوپر صرف ہوئے۔

سوال:۔ میرا یقین ہے، کہ جسمانی اور ذہنی قوتوں کے درمیان کچھ مشابہت ہوتی ہے۔ اور آپ کی شخصیت سے یہ ثابت ہوتا ہے

جواب:۔ اچھا میں آپ کو اس انٹرویو کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی تحریروں کے لئے نیک تمنا کا اظہار کرتا ہوں۔

سوال:۔ میری کتابیں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتیں۔

جواب:۔ یہی والٹیر نے کہا تھا، "میری کتابیں سنجیدہ نہیں ہوتیں"

کرشنا مینن ۔ اکیلا بھیڑیا

اب کرشنا مینن کے بولنے کی باری تھی۔ اُس کے بیشتر دہ کے حصے میں تالیاں آتی تھیں، اور بظاہر مجمع لُوٹ چکا تھا۔ کرشنا مینن ایسے لوگوں سے نفرت کرتا تھا، جو اس کی موجودگی میں مجمع لُوٹ لیں۔ وہ ناراض اور ناخوش نظر آتا۔ وہ مائیکرفون کو کھینچتا، ملیالی زدہ انگریزی تلفظ میں چند فقرے بڑبڑاتا، اور پھر میز پر گر جاتا۔ جلسہ برخواست ہو جاتا۔ ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی کرشنا مینن کو کسی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرف لے اُڑتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ انڈیا ہاؤس میں اپنے کمرے میں موجود ہوتا۔ اُس کا ذاتی معالج ڈاکٹر ابھا چار یہ جی (بنگالی وزیرِ اعلیٰ کی ایم پی آے جوی بیسنر سدھارتھ شنکر رے کا باپ) سٹیتھوسکوپ کی مدد سے اس کی چھاتی ٹٹولتا۔ کمرہ مزاج پرسی کرنے والے دوستوں، چائے اور قہقہوں سے بھرا ہوتا۔

اگلے روز کے اخبار کرشنا مینن کے متعلق سرخیوں سے بھرے ہوتے، اور جلسے کی کارروائی کو بے انتہا کوریج ملتی۔

پھر حاضرین میں موجود کوئی دوست مجھے فون کرتا ۔۔ "ہمارے پاس خبر نگار لکھنے والا کوئی نہیں۔ کیا تم مُردہ شناختی کر سکتے ہو۔۔؟" میں جواب دیتا، کہ مستقبل میں کرشنا مینن کے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اُسے کئی دفعہ گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اگر مجھے لکھنا ہی پڑا، تو اس کی سوانحِ حیات لکھوں گا۔ اخباروں میں آنے والی یہ خبریں ہمیشہ مجھے کاٹ کر بھیج دی جاتیں، تاکہ میں معلومات اَپ ٹو ڈیٹ رکھ سکوں۔

۱۹۶۲ء تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ پھر اس میں کچھ اضافہ ہوا۔ چینیوں نے نہ صرف ہماری دفاعی مشینری کا منہ کالا کیا، بلکہ انہوں نے کرشنا مینن کا نام اوراقِ تاریخ سے بھی مٹا دیا۔

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک پورے پندرہ سال ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر کم از کم ایک کالم ایسا ضرور ہوتا، جس میں کرشنا مینن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات شائع ہوتی۔ پھر وہ اچانک شہرت کے اس مینار سے گر گیا، اور اس کی یاد محو ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ جس خراجِ تحسین کا وہ حقدار تھا، دنیا نے اسے وہ بھی نہ دیا۔ اسے علی الصبح سوا دو بجے بلا لیا گیا۔ اور وہ دنیا کا آخری جملہ بھی نہ دیکھ سکا۔ ہمارے اخباروں کے صبح کے ایڈیشن اس کی بحالیِ صحت کی خبریں دے رہے تھے، اور شام کے اخباروں نے اسے صرف آدھا کالم ہی دیا۔ وہ دنیا کے ہر اخبار میں سیاہ حاشیے میں پہلے صفحے کا حقدار تھا۔ جب میں اس کی ملازمت میں تھا، تو اس وقت ہندوستانی پریس میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ بہت سے غلط لوگ اس کے گرد تھے، جس میں نہرو کے نیشنل ہیرالڈ کا چلاپتی راؤ، آر کے کرنجیا، اور اس زمانے کا مقبولِ عام ہفت روزہ بلٹز کا ایڈیٹر وغیرہ۔ بھارت کے تمام صحافیوں کی بنیاد لندن میں تھی۔ ایلک، ایلا ریڈ (ہندوستان ٹائمز) سندرکا بادی، تارہ پد بانگو، تاہانکر سب کے سب اس کے دشمن۔ وہ اپنا پی۔ آر۔ او خود تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُس نے کارنیگی کی کتاب "دوست کیسے بنائیں" ہرگز نہیں پڑھی تھی۔

۱۹۳۰ء میں جب میں لندن یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اس وقت سے میں اُسے جانتا تھا۔ اس نے انڈیا لیگ کی بنیاد رکھی تھی جس میں انگریز مرد اور عورتیں شامل تھے، جو بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھے، اور کرشنا مینن کے لئے یا اس کے حوالے سے بھارت کے کام کر رہے تھے۔ اور بھی بہت سی تنظیمیں بھارت کی آزادی کے لیے کام کر رہی تھیں، لیکن انڈیا لیگ سرِفہرست تھی۔ باقی تنظیموں کے سربراہ ڈاکٹر، وکیل یا سرمایہ دار تھے، جن کے پاس وقت سے زیادہ سرمایہ تھا، جو اس تحریک میں صَرف کر رہے تھے۔ کرشنا مینن

کے پاس پیسہ تو بالکل نہیں تھا، لیکن وقت کی کمی نہیں تھی۔ اسے بار میں کھانے پر مدعو کیا جاتا، جہاں سب لوگ ڈنر جیکٹیں پہن کر آتے۔ اُس نے کبھی قانون کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اور نہ ہی ایک دھیلے کی وکالت کی۔ اس کا دل قانون کی بجائے سیاست کی طرف راغب تھا۔ احتجاج کی تحریک میں اس کی کامیابی کا راز، مقصد کی پہچان تھا۔ اگر آپ ہند کی آزادی کے خواہاں ہیں، تو آپ کو کرشنا مینن کی مدد کرنا ہوگی، اس کے علاوہ آپ کسی کی مدد کر کے محبِ وطن نہیں کہلا سکتے۔

ٹرافلگر سکوائر کے قریب تاریک اور غلیظ دفتر میں ہم درجنوں ہندوستانی طالبعلم پوسٹر فولڈ کرتے لفافوں میں ڈالتے، ٹکٹ لگاتے، اڈریس لکھتے اور پھر پوسٹ بکسوں میں ڈالا کرتے۔ کرشنا مینن نے کبھی کسی کا شکریہ تک ادا نہ کیا، کیونکہ اس کے خیال میں ہم اس کے حقدار نہ تھے۔

اگر آپ انگلینڈ جائیں، تو آپ کو کئی ایسے لوگ ملیں گے، جو بتائیں گے کہ انہوں نے کرشنا مینن کے کھانے کے پیسے دیئے، اس کے مکان کا کرایہ ادا کیا، اسے لباس مہیا کیا، لیکن شکریے کا ایک لفظ اُن کے حصے نہ آیا۔ اور اگر کسی نے کرشنا کو یاد دلانے کی کوشش بھی کی، کہ اس نے کرشنا کے لئے کیا کچھ کیا ہے، تو یا تو اس نے اس کی بات نظر انداز کر دی، یا پھر اسے سخت سُست کہا۔ اس ناشکرے پن کے الزام نے کرشنا مینن کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا، کہ اسے دیا جانے والا چائے کا ایک کپ بھی ہندوستان کی آزادی کی خاطر دیا جا رہا ہے۔

خواتین کرشنا مینن کو خوبصورت مان ہی لیتی تھیں۔ اس میں کسی ہندوستانی فلمسٹار کی سی خوبصورتی نہیں تھی۔ وہ مفسطافلیز کی مانند زیادہ لگتا تھا۔ غصے سے بھری سُرخ آنکھیں، بکھرے ہوئے سفیدی مائل بال، اُونچی پیشانی، جس پر دونوں طرف دو نشان، جو یوں معلوم ہوتے تھے، کہ کسی زمانے میں شیطان کے سینگ تھے۔ اور اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک

ناراض سی لگی رہتی۔ وہ ہمیشہ بے داغ اور نفیس لباس پہنتا۔ برف سے زیادہ سفید ملیالی منڈو اور قمیص، اور سنہری حاشیئے والی انگاواسترم (لباس کا نام)۔ وہ جہاں بھی جاتا، یہی سمجھتا، کہ اس جیسا ذہین زمین پر اور کوئی نہیں۔ شیکسپیئر کے کاسیس سے کرشنا کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ شیکسپیئر نے کاسیس کے بارے میں لکھا تھا کہ "دبلا پتلا اور بھوکی نظروں والا کاسیس بہت زیادہ سوچتا تھا، اور ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔"

کرشنامینن زندگی کے اچھے لوازمات کا دلدادہ تھا۔ جب وہ اس قابل ہو گیا، کہ اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کر سکے، تو اس کے ضمیر نے کچوکے دینے شروع کر دیئے۔ اس نے بڑی محنت اور لگن سے پہلے برسوں میں ایک عیش پرست فاقہ کش کی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ اس نے اپنی تنخواہ جمع کی، ان خبروں کی تردید نہ کی، کہ وہ تنخواہ نہیں لیتا۔ اور ہائی کمشن کے ایک کمرے میں قیام کیا۔ اسی وقت اس نے کاروں کے ایک بیڑے کا حکم دیا، جس میں ایک رولز رائس، اس کے ذاتی استعمال کے لئے بھی تھی۔ مینن کی طرح بھی کوئی وزیر دفاع کاروں اور موٹر سائیکلوں کے جلوس میں سڑکوں پر نہیں دوڑا۔ جب وہ وزیر رہا، تب بھی وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا، لندن، اور نیویارک کے اعلیٰ ترین، ہوٹلوں میں ٹھہرتا رہا۔ صرف کھانے پینے میں اس نے سادگی برقرار رکھی۔ وہ بہت کم کھاتا تھا۔ بادام، دودھ یا نمکین بسکٹ۔ وہ ویجیٹیرین تھا۔ بیس سے تیس کپ چائے روز پیتا تھا۔ اور سونے کے وقت چائے میں لیموں نچوڑ کر پیتا، اس کا بہترین مشروب تھا۔

مینن کی ذہانت پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی تعلیمی رپورٹ یا بحیثیت وکیل کارکردگی میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کی یہ صلاحیت ۱۹۴۶ء تک پوشیدہ رہی، اور پنڈت نہرو نے اسے دریافت کیا۔ مینن میں انتظامی صلاحیت بہت کم تھی۔ وہ اکثر اوقات چیزوں کا توازن بگاڑ دیتا تھا۔ پنڈت نہرو نے اس کی سرپرستی کی۔ پنڈت نہرو ایک مشفق باپ کا کردار ادا کرتے رہے، اور کرشنامینن ایک

بگڑے بچے کا۔ جو ہر ناپسندیدہ شخصیت کے منہ پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا، یا اس پر تنقید کرتا۔

وہ کمال بے خوفی سے سینئر سول سرونٹس اور ٹو سٹار جرنیلوں کی بے عزتی کر دیتا۔ دھمکی کے طور پر استعفیٰ دے دیتا، اور پھر واپس لے لیتا۔ مسز نہرو کا مذاق اڑاتا۔ پنڈت جی کے پرائیویٹ سیکرٹری کو گالیاں دیتا۔ حتیٰ کہ کابینہ کے وزیروں کو ان پڑھ گاؤدی سمجھتا۔ پیرس میں ایک میٹنگ کے دوران اس نے بھارت کے سفیر سردار ایچ ایس ملک کو اتنا ذلیل کیا، کہ ہاتھا پائی کی نوبت آتے آتے رہ گئی۔ سفید فام لوگ اس کا من پسند نشانہ تھے۔ وہ سفید فاموں کے کالوں پر صدیوں کے ظلم کا تنہا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ رویہ اس قدر جوش و جذبے سے اپنایا، کہ اپنے پرائے اس کے دشمن بن گئے۔

عام طور پر وہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں مسلسل تیرہ گھنٹے تقریر کرنے پر مشہور ہے۔ ظاہراً وہ بھارت کے موقف کا ہر پہلو واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں مینن کی وجہ سے ہماری دوستی یورپ، امریکہ اور چین سے ختم ہو گئی، لیکن اس کے عوض اس نے روس، عرب اور افریقیوں کو ہمارا دوست بنا دیا۔

کرشنامینن پنڈت نہرو کی تخلیق تھا۔ ۱۹۶۲ء میں چینی حملے کے بعد جب نہرو کا اپنا ستارہ دھندلانے لگا، تو کرشنامینن کی شامت آ گئی۔ نہرو کی موت کے بعد کرشنامینن کی شہرت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔ کمیونسٹوں نے اسے خون دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مینن نے سپریم کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اسے کچھ مقدمے ملے، لیکن اس نے مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور کئی موقعوں پر ججوں کو یاد دہانی کرانی پڑی، کہ وہ عدالت میں بحث کر رہا ہے، کسی سیاسی جلسے سے خطاب نہیں کر رہا۔ پھر کوئی مقدمہ اس کے پاس نہ آیا۔

تاریخ مینن کو کن الفاظ میں یاد کرے گی۔ ایک بے بنیاد انتشار کی مانند یا کسی شہاب ثاقب کی طرح۔ جو چمکا، تو ہر ستارہ ماند پڑ گیا، اور جب ٹوٹا، تو جہاں جہاں گرا،

وہ جگہ جلا دی، اور پھر خود بھی نابود ہو گیا۔ تیسری دنیا کے ممالک کی ناوابستہ تحریک، اس کا بیج، پنڈت نہرو کا منصوبہ تھا۔ عربوں کے حقوق اور افریقیوں کی جدوجہد کا ساتھ اصل میں پنڈت جی نے دیا تھا۔ لیکن یہ مینن تھا، جس نے ان منصوبوں پر تقریریں کی، اور ان کو اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ کیونکہ وہ الفاظ کو رائج الوقت سکے کی مانند ڈھال سکتا تھا۔

یہ وہی کرشنا مینن تھا، جس نے پاکستانی جارحیت کی مذمت کی تھی، اور حیدرآباد اور گوا کو پولیس کے حوالے کرنے کو کہا تھا۔

مینن کوئی زیادہ عالم فاضل شخص نہیں تھا۔ اس کی اصل تعلیم ہیرلڈ لاسکی، اور لندن سکول آف اکنامکس تک محدود تھی۔ طباعت کتب میں اس نے چند روز گزارے۔ اس نے پیلیکن کتابوں کا صرف پہلا صفحہ ایڈیٹ کیا تھا۔ سیاست نے اسے اخبار کے علاوہ مطالعے کے لئے وقت ہی نہ دیا۔ لیکن نہ جانے وہ دوسرے سیاستدانوں اور پارلیمنٹرین سے برتر کیوں تھا۔ ویسے بھی ہندوستانی سیاستدانوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے برتر ہونا کوئی مشکل نہیں۔

کرشنا مینن نہیں جانتا تھا، کہ دوست کیسے بنائے جاتے ہیں۔ البتہ اس میں دوستوں کو کھونے اور دشمن پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نے بے شمار معاشقے کیے، اور کئی دل توڑے۔ اس نے محبت حاصل کی، اور چونکہ وہ محبت دے نہیں سکتا تھا، اس لئے یہ میدان بھی خاصا سرد رہا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں صرف ایک خاتون کے ساتھ اس کے مراسم تھے۔ ایک رنگین، قابل دید اور شاندار شخصیت کا یہ افسوسناک انجام ہے۔

فرینک مورلیس

جب انسان مرجاتا ہے، تو سچ ختم کرنے کے لئے کسی کنونشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فرینک مورلیس کی موت کے بارے میں خبروں پر اس کے دوست کم ہی یقین کر پائے۔ وہ ایسا شخص تھا جو شراب، عورت اور اپنے کام سے اُسے ایک جیسی لگن تھی۔ شراب نوشی کے دوران وہ اکثر ذہنی طور پر حاضر ہوتا۔ اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر تحریر کرتا، اور جرأت سے کہتا، کہ جو اس نے سوچا ہے، بالکل درست ہے۔ اس کی بہت سی اعلیٰ خوبیوں میں سے ایک یہ تھی، کہ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتا، اور مقدور بھر کوشش کرتا، کہ لوگوں کے کام آسکے۔

ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر دیوداس گاندھی نے جرنلسٹوں کی میٹنگ کی، تو وہاں میری ملاقات پہلی بار فرینک مورلیس سے ہوئی۔ میٹنگ اس امر پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی تھی، کہ حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا کیا کیا جائے۔ دیوداس جتنا پابندی کے حق میں تھا فرینک مورلیس اتنا ہی مخالف۔ ہمارا خیال تھا، کہ دونوں میں زبردست اختلافات ہوں گے۔ دیوداس کا خیال تھا کہ اس کے دلائل زیادہ وزن دار ہیں، اس لئے فرینک کو اس کی بات مان لینی چاہیے۔ فرینک کے لئے یہ برداشت مشکل تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے جو ظاہر ہوا وہ گالیاں تھیں، مرارجی ڈیسائی کے لئے، دیوداس کے لئے، اور دوسرے ہمنواؤں کے لئے۔ اس بحث کا نتیجہ جذباتی شور و غل کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا۔

فرینک مورلیس اسرائیل کا زبردست حامی تھا، اور صدر ناصر کا بے رحم نقاد۔
کنگسلے مارٹن جوان دنوں میرے پاس دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا، مجھے ایک واقعہ سنایا:۔
یہ واقعہ ایک ڈنر پارٹی میں پیش آیا۔ جو عرب لیگ کے ایک نمائندے حکرس
معقود نے ترتیب دی تھی۔ اور قومی اخبارات کے مدیروں کا مصری سفیر سے تعارف
کروایا جانے والا تھا۔ فرینک کو بہت اہم جگہ پر بٹھایا گیا۔ اس کی عزت افزائی کی گئی۔
سفیر کی بیگم کے برابر جگہ دی گئی۔ بات چیت کے آغاز کی خاطر معقود نے فرینک سے صدر ناصر
کی اسرائیل کے ساتھ امن کی کوششوں کے بارے میں رائے لی۔ صدر ناصر جھوٹا ہے۔
فرینک نے جواب دیا۔ معقود کو شاید سننے میں غلطی لگی۔ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
مورلیس نے سناٹک بے تکلفی سے اپنا جواب دہرایا۔
اسی وقت مہمان خصوصی اور اس کی بیگم دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈنر بڑی خاموشی
میں ختم ہوا۔ کنگسلے کا کہنا ہے، کہ فرینک مورلیس نے اس دن پارٹی میں شراب کو ہاتھ
تک نہ لگایا، اور کمال سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے میزبانوں سے اپنے درشت
رویے کی معذرت طلب کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

اگر فرینک مورلیس سلور سٹون کے پاس نہ گیا ہوتا، تو آج سے دس سال قبل جگر
کی سوزش کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ یہ نوجوان، خوبصورت اور صحت مند، اور جرأت مند
فری لانس فوٹو گرافر فرینک کی قریب ترین دوست بن گئی۔ اس نے بیماری میں
اس کی تیمارداری کی، شراب نوشی پر قابو پایا، اور اسے ایک بیوی کی مانند آرام
مہیا کیا۔ کنجوس ہونے کی بناء پر فرینک کے لئے یہ ممکن نہ تھا، کہ وہ بیوی کو طلاق دے
سٹون سے شادی کر لیتا۔ لندن میں سٹون کے گھر میں فرینک کی موت ہوئی۔ تاہم کسی نے
بھی اس امریکی لڑکی کی تعریف میں دو الفاظ نہ لکھے۔

فرینک کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے ڈوم کی سوانح عمری پڑھنی چاہیئے۔
"میرے بیٹے کا باپ"، اس نے اپنے دادا کی تمام خوبیاں ورثے میں حاصل کیں۔
وہ اپنے باپ سے زیادہ حساس تھا۔ اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتا تھا۔
اور اتنی زیادہ پی سکتا ہے، جتنی فرینک اپنی جوانی کے دنوں میں پیا کرتا تھا۔

گرودیو۔ مکت آنند

بمبئی سے پچاس میل دُور، لیکن بمبئی کے پُرشور ہجوم سے ہزاروں میل دُور یہ جگہ میں نے پہاڑی کی ایک چوٹی سے دیکھی تھی۔ براؤن رنگ کے کھیتوں میں جگہ جگہ چاول کاشت کیے گئے تھے، اور بعض علاقے ایسے تھے گویا شیو کیے گئے ہوں۔ پہاڑیوں کا ایک دائرہ جن کے نام ایسے ہیں، جیسے مندروں کی گھنٹیوں کی آواز۔ شمال میں منداگی، ماؤلائی، جہاں سے سُورج طلوع ہوتا ہے، اور تنگا شیور جہاں یہ غروب ہوتا ہے۔ اور اس وسیع و عریض وادی کے بیچوں بیچ سُنہری دھاگے کی طرح تیجا ساندی بہتی ہے۔ ٹیک کے درختوں کے بڑے بڑے پتے جھکے ہوئے ہیں۔ بیل ابھی تازہ کھال اوڑھے کھڑا ہے، اور ریشمی کپاس کے پھول کھلنے ہی والے ہیں۔ سُورج پُوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ذہنی بیٹریوں کو چارج کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ روئے زمین پر کوئی نہیں۔ میں تو وہاں صرف یہ دیکھنے گیا تھا، کہ آیا میری رُوحانی بیٹری میں کوئی سپارک باقی ہے؟ میں بابا مکت آنند کو ملنے گیا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں کہ تمہارے آباؤ اجداد نے بے شمار گرو اور سوامی پیدا کیے ہیں۔ اور اگر تم ابھی اس عمر میں مذہبی شخصیت سے جا رہے ہو، تو اپنے قارئین کو اس کے اثرات سے بچانا۔ میں مذہبی دیوانہ نہیں بن رہا۔ لیکن گرو جہاں ہیں، میں اُن کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ اُن کے تجربات مجھ سے مختلف ہیں۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں متجسس ہوں اور تجسس مذہب ہے۔

دس پندرہ روز ہوئے، ایک رات میری مُلاقات بالیو گیٹور سے ہوئی۔ میں نے اُسے سسٹم کی مشکلات کے متعلق یقیناً نہیں پوچھ رہا تھا۔ میں ایک گھنٹہ مالوگ شکتی سروتی کی حاضری میں بھی رہا۔ میں اُن لوگوں سے بھی ملا، جو کرشنا کے پجاری ہیں، لیکن مجھے کسی آشرم جانے کا اتفاق نہیں ہوا، اور مکت آنند جی کا دھر لیشوری کا یتیم خانہ بہت موزوں بنایا گیا ہے۔

آشرم بھی کئی اقسام کے ہیں۔ گاندھی جی نے ٹالسٹائی فارم اور سابرامتی آشرم بنا رکھا تھا، جہاں اُن کے پیرو کار اپنا کھانا خود تیار کرتے تھے، اور اپنے لیے کپڑا خود بُنتے تھے۔ عبادت کی بجائے کام پر زیادہ زور تھا۔ جے پرکاش نرائن کا بھی الگ آشرم تھا، جہاں صرف کام ہی کام تھا، عبادت کا ذکر ہی نہیں تھا۔ گورودیو مکت آنند کی بات ہی اور ہے۔ زیادہ وقت عبادت اور مراقبے میں گزارا جاتا ہے، اور تھوڑا وقت کام سماج کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی عمارت خاصی بڑھیا ہے۔ سنگ مرمر اور چاندی کا بے انتہا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمتی قالین اور فرنیچر، جدید بنگلے، سبزیوں، پھلوں کے باغات، جہاں، ٹماٹر، کیلے، آم، چیکو اور پپیتا کی کاشت کی گئی ہے۔ اور ایک کالا ہاتھی جس کا نام سرای وجے آنند ہے، اور جو چارے کے لیے اپنی سُونڈ اوپر اٹھاتا ہے، لیکن اُسے سب سے زیادہ آم اور غیر ملکی چاکلیٹ پسند ہیں۔

مکت جی آنند، دوسرے گوروؤں سے مختلف ہیں۔ ٹیک وُڈ سے تیار کیے گئے استقبالیہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جہاں ان کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ داخل ہوئے، تو مجھے یوں محسوس ہوا، کہ ایک ایسا شخص سامنے ہے، جس کی لاکھوں لوگ خدا کی مانند پرستش کرتے ہیں۔ ان کی لنگی اور قمیض سنیاسیوں جیسی تھی۔ ان کی روئی ٹوپی پر پھندنا بھی تھا۔ گہرے شیشوں کی عینک لگائے وہ ایک بے محل سی شخصیت لگ رہے تھے۔ جب وہ بروکیڈ لگے صوفے پر بیٹھ گئے، تو ان کے رویے سے دوستی

اور بھائی چارے کی عجیب خوشبو سر آمد ہوئی، جس کا مجھے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔

"میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"یقیناً" انہوں نے جواب دیا۔ "میں اپنی عقل کے مطابق بہترین جواب کروں گا۔ کیوں پہلے آشرم پر ایک نظر کیوں نہ ڈال لی جائے۔ پھر واپس آکر مجھ سے جتنے جی چاہے سوال کرو، بلکہ جس سے جی چاہے، پوچھو۔"

مجھے سر آمدے، کمرے، ڈائننگ روم اور لائبریری دکھائی گئی۔ مجھے سر آمدہ نما کمروں میں لے جایا گیا، جو مراقبے کے لئے مخصوص تھے۔ وہاں میں نے کئی مرد، خواتین کو دنیا و مافیہا سے بے خبر پایا، جو کمر سیدھی رکھے پدم آسن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سہ پہر کے بعد مکت آنند جی مراقبے کے کمرے میں آئے۔ انہوں نے اپنے غیر ملکی پیروکاروں کو طلب کیا۔ چار امریکی اور ایک فرانسیسی لڑکی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔

مکت نند جی بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ ہندی اور مراٹھی سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے۔

"لوگ آپ کے پاس کیوں آتے ہیں ——؟" میں نے ہندی میں پوچھا۔

"مختلف وجوہات کی بنا پر۔ کچھ ناخوش، کچھ پریشان اور کچھ متجسس۔"

سوال:۔ "وہ آپ سے کیا حاصل کرتے ہیں؟"

جواب:۔ "وہ ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ مراقبے کے ذریعے وہ اس قابل ہوتے ہیں، کہ اپنے آپ کو اور خدا کو، جو ہر ایک کے اندر ہے، جان سکیں۔"

سوال:۔ "کیا ذہنی سکون ہی ایک فقط مقصدِ حیات ہے۔ میرے خیال میں یہ خود غرضانہ بات ہوگی۔ ایک انسان کو اپنی نسبت دوسروں کو زیادہ دینا چاہیئے۔"

جواب:۔ "وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے، جب کوئی شخص خود مکمل طور پر سکون حاصل کر لیتا ہے، تب وہ دوسروں کو بھی اس میں سے حصہ دیتا ہے۔"

ان کے چیلے بھی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں، اُما، دیانتی اور چندرا سب امریکی ہیں، لیکن ہندوؤں جیسے نام رکھ لیے ہیں ——۔ "ہم صرف گھر سے بھاگے ہوئے بچے نہیں ہیں۔ ہم اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں ——" وہ کہتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، کہ پہلے انہوں نے اپنی پریشانیاں منشیات کے ذریعے دور کرنا چاہی تھیں۔

سوال:۔ "پھر اب کیسا لگتا ہے ——؟" میں نے پوچھا۔

جواب:۔ "میں اس وقت بھی زیادہ خوش نہیں ہوں، لیکن مجھے سکون سب ہے۔"

اُن میں سے ایک جس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں، غالباً دیانتی ہے جواب دیتی ہے۔

سوال:۔ "سکون سے دنیا میں کوئی قابلِ ذکر چیز تو پیدا نہیں ہوئی۔ یہ تو ذہن کی بے آرام کرنے والی اپج ہے، جس کے نتیجے میں ادب، موسیقی، سائنس میں شاہکار تخلیق کیے گئے۔ یہ برقی ساز و سامان، پنکھے، ایئر کنڈیشنرز، بلب وغیرہ وغیرہ یہ سب ان لوگوں کی ایجاد ہیں، جن کو ذہنی سکون نہیں تھا۔ دنیا ان کی تکلیف سے فائدے میں رہی۔"

جواب:۔ "ہم اتنے خوش ہیں، کہ ہم کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

سوال:۔ "یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ آخر سائنسی ایجادات، مصوری اور موسیقی کے بغیر دنیا کیسی دنیا ہوگی؟"

جواب:۔ "جو کچھ ہمارے پاس ہے، ہم سب اس کو اچھی طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم سب مائیکل اینجلو یا بیتھوون تو نہیں ہو سکتے۔"

سوال:۔ "لیکن یہ مراقبہ، تو میری نظر میں وقت کا ضیاں اور خود غرضی کا حامل ہے۔ میں تو کوئی کتاب پڑھنے یا آنکھیں بند کر کے جاگنے کی بجائے حقیقتاً سونا زیادہ پسند کروں گا۔"

سب ہنسنے لگتے ہیں۔ مکت جی اپنے سب سے قریبی چیلے سری یاندی سے پوچھتے ہیں، کہ کیا باتیں ہوئی ہیں۔ وہ مختصراً ساری بات بتاتا ہے۔ گورو دیو کچھ بات یاد رکھنے کو کہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مکت آنند صاحب ہر ایک کو اپنی قربت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ ہر اُن سے ملنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ان کی نظروں میں بہت ہی مقدس شخصیت ہے۔ اتنے مختصر وقت میں کسی ایسے آدمی سے قربت کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہم بحث کرتے رہتے ہیں، اور بالآخر مراقبہ اور کام کے تعلق پر رُک جاتے ہیں۔

"تم خود اس کا تجربہ کیوں نہیں کرتے ۔۔۔" اُما کہتی ہے، جو آشرم کا نیوز لیٹر مرتب کرتی ہے۔ "کسی ایسے شخص کو چاکلیٹ کا مزا سمجھانا بڑا مشکل ہے، جس نے کبھی بھی چاکلیٹ کو چکھا بھی نہ ہو۔"

تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اب پروفیسر جین اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ مجھے خاصا زچ کرتا ہے۔ "ہر کوئی اپنا کام اپنی صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے۔ تم ہفت روزہ مرتب کرتے ہو، اُما ہمارا نیوز لیٹر۔ دونوں یکساں اہم ہیں۔" میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ مسکراتا ہے، اور بات جاری رکھتا ہے۔ "شیکسپیئر کو اپنی نظمیں اور ناول لکھنے میں ایک عمر گذر گئی۔ ہمارے گورو دیو نے صرف سترہ دنوں میں "ونیشٹ شکتی ولاس" لکھ دیا ہے۔ یہ ضمیر کے متعلق ایک ڈرامہ ہے۔ یہ شیکسپیئر کی ہر تحریر سے بلند ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ذہنی اُبھار یا تحریک کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ اس کا باعث ہمارے ذہن کا مکمل سکون ہوتا ہے۔

لڑکیوں کا خیال ہے، کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے مفرور نہیں ہیں۔ اگرچہ آشرم کی زندگی سکون و آرام کی زندگی ہے۔ تاہم صبح ساڑھے تین بجے اُٹھنا، سارا دن کام، عبادت اور مراقبہ کرنا اور وہ نہایت پابند ماحول میں کوئی آسان کام نہیں۔"

"آخر کس مقصد کے لئے ۔۔۔؟" میں پوچھتا ہوں۔ "میں خدا پر یقین نہیں رکھتا، اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں، تو پھر میں اپنے اندر کے خدا کی تلاش کیا کروں ۔۔۔؟"

"تمہارے اندر اس سے کہیں زیادہ اعتماد ہے، جو تم بیان کر رہے ہو۔" تمام

لڑکیاں ایک دم بول اُٹھتی ہیں ۔۔۔ "آؤ ہمارے ساتھ چند دن آشرم میں گذار کر دیکھو۔"

"تم جیسی خوبصورت لڑکیاں مجھے راہ سے بھٹکا دیں گی۔" میں کہتا ہوں۔

وہ خوشی سے مسکراتی ہیں۔

میں مکت آنند جی سے اجازت لیتا ہوں۔ اور ان گستاخ سوالوں کی معافی طلب کرتا ہوں، جو میں نے ان سے اور ان کے چیلوں سے کئے تھے۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں، اور کہتے ہیں ۔۔۔ "یہ سوال گستاخ نہیں تھے، ایمانداری پر مبنی تھے، تم پھر بھی آ سکتے ہو۔"

میں پھر دھیشوری جاؤں گا۔ دوسرے لوگ تو اپنی روحانیت تازہ کرنے جاتے ہیں، لیکن میں پھولوں میں لگی سُرخ آگ دیکھنے جاؤں گا۔ پہاڑوں کی تازہ اور صاف ہوا میں سانس لوں گا۔ اور مکت آنند جی سے اس بات کی ضمانت لوں گا کہ میں اتنا گستاخ نہیں ہوں، جتنا اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔

منظور قادر — ایک بچھڑا ہوا دوست

میرا نہایت ہی عزیز دوست بستر مرگ پر پڑا ہے۔ میں اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں جا سکا۔ اس کے بیوی بچے مجھ سے ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے فاصلے پر تھے میں ان سے ملنے نہ جا سکا۔ میں ان کو خط نہ لکھ سکا نہ ہی فون پر حال معلوم کیا وہ پاکستانی ہیں۔ میں بھارتی ہوں — ہم کیسے ہمسائے ہیں — کیا ہمیں مہذب کہلوانے کا حق ہونا چاہیے۔

میں نے اخبار کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ ایک دوست فون پر مجھے بتاتا ہے کہ میرا پیارا یار چلا گیا ہے — خون میری رگوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ میں نے اخبار ردی کی ٹوکری سے نکالا۔ سیاہ اور سفید پٹی میں لکھا تھا منظور قادر کا انتقال ہو گیا جب وہ لندن میں آخری سانس لے رہا تھا۔ میں بمبئی میں وودھ بھارتی سن رہا تھا اور شراب کی چسکیاں لے رہا تھا اور جب اسے لاہور میں آبائی قبرستان میں اتارا جا رہا تھا میں کولابا میں اپنے ہاتھ افسوس سے مل رہا تھا۔ وہ پاکستانی تھا میں بھارتی —

کہا جاتا ہے کہ جب کوئی مر رہا ہو تو اس کی ساری زندگی اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے منظور قادر کے مرتے ہوئے احساس کے سامنے سے گذرا ہوں گا کیونکہ وہ بھی مجھے ایک عزیز دوست کی مانند سمجھتا تھا۔ سارا دن میں یہی یاد کرتا رہا میری اس کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب کیسے آئے۔ بیس سال قبل پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان موضوع زیر بحث موت تھا۔ اس کی بیوی، صغریٰ کے بھائی نے اپنے باپ میاں فضل حسین کی آخری

خط لکھا تھا میں اس کے ریفرنس دیتا رہا۔

میں موم بتی کی روشنی میں کام کر رہا ہوں
اس کا شعلہ بھڑک رہا ہے
یہ ختم ہو گئی ہے

منظور قادر تضادات کا مجموعہ تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ کوئی زیادہ ہونہار نہیں تھا۔ لیکن وہ پاکستان کا قابل ترین وکیل بنا۔ قانون کے بعد اس کی زیادہ دلچسپی عہد نامہ عتیق اور قرآن کا مطالعہ تھی۔ وہ شروع سے آخر تک لاادری نظریہ پر کاربند رہا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور اردو زبان میں اس نے چند بہت اچھی نظمیں تخلیق کیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتہا درجے کا رجعت پسند۔ تقریر میں ناپ تول رکھنے والا اور سلیقے سبھاؤ کا قائل تھا اگرچہ پنجابی گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن ہندوستانی زبان کا رسیا تھا اور بڑی صاف زبان بولتا تھا۔ وہ بڑا مفصل بیان تھا لیکن بور نہیں کرتا تھا وہ منشیات کا مخالف تھا لیکن گفتگو میں شمپین کی بوتل کی طرح زندہ دلی کے بلبلے چھوڑتا تھا۔

اس کے کردار کے نمایاں پہلوؤں میں رحم دلی ... دیانتداری تھی اس نے کبھی کسی کے بارے میں نقصان دہ گفتگو نہیں کی۔ اس کی دیانت داری ایمان کی حد تک وسیع تھی وہ پچاس ہزار روپیہ ماہوار کماتا تھا۔ لیکن انکم ٹیکس والے ہر سال اسے زائد جمع ہونے والا ٹیکس واپس کرتے تھے۔ وہ روپے پیسے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا اس کے بارے میں عام خیال یہ تھا، خدا جھوٹ بول سکتا ہے منظور قادر نہیں — اس کے اندر ولیوں کی سی سچائی تھی۔

دوستوں کی نظر میں اس کی عزت و توقیر بے مثال تھی۔ تقسیم ملک کے کچھ عرصے بعد ہم کچھ دوست جی ڈی کھوسلہ کی کتاب "EASTERN RECKONINGS" پر گفتگو کر رہے تھے جس میں اس نے تقسیم کے دوران مشرقی پنجاب میں ہونے والے فسادات کو گناہوں کی سزا ثابت کیا تھا ہم کھوسلہ کو اس کے کڑوے بیان پر ڈپٹ رہے

تھے۔ وہ اور اس بیوی ہمیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش میں تھے ایک دوست نے حوصلہ نے مجھے بھر کو سوچا اور پھر کہا کہ نہیں — ہرگز نہیں — اس کے ساتھ ہی اس کے دلائل بھی ختم ہو گئے۔ ہمیں احساس تھا کہ منظور قادر کا ردعمل کیا ہوگا۔ صحیح یا غلط۔ وہ ہماری اخلاقی انداز کا ستون تھا۔

منظور قادر کو سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اخبارات پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بین الاقوامی حالات نے اس کی ناواقفیت بے پایاں تھی۔ لندن میں ایک دن ہمیں ڈاکٹر حسن یات سن کی ایک نیوز ویل دیکھنے کا اتفاق ہوا منظور نے مجھ سے پوچھا یہ سن یات سن کون تھا۔ جب میں نے اس کی واقفیت عام کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو کہنے لگا ہوگا سالا کوئی بنگالی ڈاکٹر —“ بعد میں شام کو جب میں نے یہ واقعہ اس کی بیٹی شیریں کو بتایا تو اس نے اپنے باپ کو برا بھلا کہا اس نے مجھ سے قسم لی کہ میں کسی اور کو یہ واقعہ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا لیکن جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ صدر پاکستان محمد ایوب خان نے منظور قادر کو وزیر خارجہ مقرر کیا ہے تو میں نے مبارک باد کا تار بھیجا جس پر دکھا تھا: ”بنگالی ڈاکٹر سن یات سن کی طرف سے مبارک باد —“

جب وہ وزیر خارجہ تھا اس وقت میں نے اس کے ساتھ چھٹیوں کے چند دن گزارے میں اپنے گھر میں خود ہی مہمان کی حیثیت سے رہا (۱۹۴۷ء) میں جب میں نے لاہور سے ہجرت کی تو اپنا گھر منظور قادر کے حوالے کر دیا تھا جس نے اس کی خوب حفاظت کی۔ ہمارے سکھ نوکروں کی جان بچائی۔ رات کو انہیں بحفاظت سرحد پار کروائی۔ فرنیچر اور میری لائبریری کی تمام کتابیں مجھ تک پہنچائیں حتیٰ کہ میری شراب کی الماری میں بچی کھچی شراب بھی روانہ کر دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ وزیر خارجہ کیسے بنا اس نے محمد ایوب خان کے آمرانہ رویے پر ایک میٹنگ میں سخت تنقید کی تھی۔ اس رات ایک ملٹری جیپ اُسے لے جانے آگئی یہ جان کر کہ اُسے گرفتار کیا جا رہا ہے اس نے اپنے خاندان کو خدا حافظ کیا۔ اسے صدر کی رہائش گاہ لے جایا گیا،

ایوب خان نے اس سے کہا: ”تم اگر مجھ پر یا میری حکومت پر تنقید کرتے ہو تو پھر تمہیں اس ذمہ داری کا اہل ہونا چاہیے۔ اور ان خامیوں کو درست کرنا چاہیے جن پر تم نے تنقید کی ہے —“ منظور قادر جب گھر واپس آیا تو وہ وزیر خارجہ بن چکا تھا۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے منظور قادر تو کبھی کسی عہدے یا اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کبھی کسی سے اُلجھتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو اس قابل سمجھتا تھا کہ اس سے اُلجھا جائے۔ وہ سیاستدانوں کی باتوں کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اپنے چار سالہ وزارتِ خارجہ کے دور میں اس نے بھارت سے بہتر تعلقات قائم کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن جب اس نے یہ عہدہ چھوڑا تو اسے تاسف کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس نے مجبوراً چیف جسٹس کا عہدہ قبول کیا اور جب اسے چھوڑنا چاہا تو حکومت نے اُسے مجبور کیا کہ وہ ایسا نہ کرے اس نے حکومت کے خلاف ہر سازش کیس میں بین الاقوامی ٹریبونل کے سامنے حکومت کی اعانت کی۔ سکندر مرزا ہو یا ایوب خان، یحییٰ خان، یا بھٹو — پاکستان کا کوئی بھی حکمران منظور قادر کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

گزشتہ سال میں نے مری میں نتھیا گلی میں اس کے ساتھ ایک دن بسر کیا وہ بہت بیمار تھا۔ اُسے کی بیماری تھی۔ لیکن پرانی دوستی کی خاطر وہ اسلام آباد تک کار چلاتے ہوئے مجھے لینے آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جنرل ٹکا خان سے لے کر ادنیٰ ترین لوگ بھی اسے راستے میں کتنے عزت و احترام سے ملے۔ ہاتھ مارنے اور سلام علیکم کہنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُس نے اپنی بیماری کی صعوبتیں نہایت بے جگری سے برداشت کیں اور مذہبی اعتقادات کا سہارا لینے سے انکار کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی اب چند روز ہی رہ گئی ہے لیکن اسے موت کا کوئی خوف نہیں تھا مجھے یاد نہیں آ رہا کہ وہ اُردو کا کونسا مصرع گنگنایا کرتا تھا لیکن اس کا مطلب کچھ ایسے تھا: ”اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں اس تاریکی کا ایک دلہن کی طرح استقبال کروں گا۔ اور اپنے آپ کو اس کے بازوؤں میں“

دے دوں گا۔ ہماری آخری ملاقات کے اختتام پر اس کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

لندن کے اسپتال میں اس کی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک انگریز دوست نے مجھے بتایا۔ لیکن وہ بھی اس کی موت کے وقت وہاں نہیں تھی منظور رتا در جیسے دوست کے لیے خراجِ تحسین صرف آنسوؤں ہی سے لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ آنسو کاغذ پر گرنے نہیں چاہتیں اسے دوامی عزت حاصل ہے اور اس کی موت کا غم بھی دائمی ہے۔

ڈاکٹر ایس رادھا کرشن - ایک تخلیقی جوہر

حیاتِ انسانی اولمپک گیمز کی مانند ہے۔ فیثاغورث نے لکھا تھا کچھ تو کامیابی حاصل کرتے ہیں کچھ کامیابی کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ محض تماشائی ہوتے ہیں اور یہ آخری گروہ فلاسفروں کا ہے۔" افلاطون نے ایک فلاسفر کی زندگی کو خاموشی، تنہائی اور دنیا و مافیہا سے بے خبری سے تعبیر کیا ہے۔ فلاسفر اچھائی کی تلاش میں ہی زندگی حاصل کر لیتا ہے ویدانت اصطلاح میں اسے چیتہ سندھی یعنی ملِ پاکیزگی کہتے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زندگی، اولمپک گیمز کے ہر پہلو پر محیط تھی وہ تاجر تھا۔ تو کاروبار کے لیے آیا تھا۔ ایک ایتھلیٹ کی طرح جس نے (بھارت رتنا) سب سے بڑا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اور ایک فلاسفر جس نے اپنی نرم خو آنکھ سے دنیا کا کاروبار دیکھا اور اپنی ساری زندگی دانا پراشتنا سے کر چیتہ سندھی کی تلاش میں گزار دی۔ میں اسے زندگی کے ان تمام شعبوں میں سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔

پہلی ملاقات کے وقت وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب و اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ میں نے اس کی تمام تحریریں پڑھ رکھی تھیں اور اس سے گفتگو کے دوران اس کی تحریروں کے حوالے دیئے تھے مجھے یاد ہے میں نے اس کی خوشامد پسندی پر حملہ کیا تھا اور اسے زچ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ خوشامد پسند تھا اور اسے اچھا سمجھتا تھا۔ جب وہ ماسکو میں سفیر تھا تو میں نے اسے سکھوں کی تاریخ کے تراجم جو میں نے کیے تھے بھیجے۔ اس نے جواباً میری غلطیوں کی نشاندہی کی اور مجھے ویدانت پڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ سکھ ازم کے بارے میں وضاحت سے جان سکوں۔ وہ رحمدل گرو تھا اور جن لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کرتا

تھا ان کے لیے تکالیف بھی اٹھاتا تھا۔

۱۹۵۰ء میں جب وہ فلورنس کی یونیسکو کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کے لیے گیا تو میں اس کے زیادہ قریب آگیا۔ اس وقت میں اس کا پریس آفیسر تھا۔ ہر صبح اور شام ملاقات ہوتی۔ میں اس کی تقریروں کی رپورٹنگ کرتا اور اس کے انٹرویو کرواتا۔ کانفرنس میں اس کی تقریر بہت ہی مدلل تھی اس نے نہایت عمدہ تقریر کی۔ لیکن جب وہ واپس آیا۔ اسے دو دفعہ ہی خطاب کرنا تھا چنانچہ وہ فارغ ہو کر اپنی کتابوں کی طرف راغب ہوا جو اس کے بستر کے قریب بکھری پڑی تھیں۔ وہ صرف حالات سے واقفیت رکھتا تھا لیکن کانفرنس کی کارروائی کو ذہن پہ سوار ہونے نہیں دیتا تھا۔

بھارت نے کمیونسٹ چین کو تسلیم کرنے کی قرارداد پیش کی تھی اور اس موقع پر اسے ایک سیشن سے خاص طور پر خطاب کرنا تھا اس مسئلے پر اس نے جو کچھ کہنا تھا کہا لیکن اپنے دلائل واضح کرنے کے بعد اس نے حاضرین سے ایک سوال کیا جو اس کے دماغ کی اولین سطح پر موجود تھا "بڑھتی ہوئی انسانی شخصیت میں تنہائی کی اہمیت، ذہن کی مکمل خاموشی، قوت ارادی، روح کا حلا مخل کا فقدان — اس روشنی کی کمی جو ہمیں صحیح بنی نوع انسان بننے میں مدد دیتی ہے" وغیرہ وغیرہ

ایک مشہور و معروف ہالی وڈ فلم سٹار غالباً مرنیالائے نے رادھا کرشنن کے ساتھ فلسفے کے چند مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے وقت مانگا۔ میں اسے ڈاکٹر کے کمرہ آرام میں لے گیا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں ملبوس اپنے بستر میں دراز تھا اس نے کتابوں ایک طرف پرے دھکیلی، بستر پر جگہ بنائی اور اپنی میزبان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ فلم ایکٹرس نے ہچکچاہٹ محسوس کی۔ شاید وہ ایک فلاسفر کے پاس بیٹھنے سے اپنی حیثیت کم ہو جانے کے اندیشے میں تھی۔ رادھا کرشنن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا "خاتون آپ کتنے مردوں کی بیوی رہ چکی ہیں (اس وقت یہ خاتون امریکی وفد کے لیڈر پر شادی کے ڈورے ڈال رہی تھی) اس

نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ فلسفے پر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

کرشنا مینن کے نائب صدارت اور راشٹرپتی کے دور کے بارے میں کم ہی جانتا ہوں۔ جب اس نے مجھے یاد دہانی کرائی کہ مجھے اس سے ملے عرصہ ہو گیا ہے تو میں نے کہا کہ صدر کا وقت زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے اسے میرا جواب پسند نہ آیا زیادہ تر لوگوں نے کام لیا تھا بہت سے شرمناک حد تک۔ اس کا استحصال کیا اس نے کبھی غصے کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی لوگوں کی اس کمینگی پر برہم ہوا۔ میری اس کی آخری ملاقات تین سال قبل مدراس میں ہوئی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا اس کی آنکھ کا آپریشن ناکام ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ میری بیٹی سے اس کے مستقبل کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اس نے پیروں سے فرش پر اپنے سلیپر ٹٹولے، بستر سے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا "جب بھی مدراس آؤ تو ملے بغیر نہ جاؤ" مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ صرف تین سال زندہ رہے گا۔ شاید وہ ایک کامیاب ترین انسان تھا جو میری نظر سے گذرا۔ مجھے گیتا کے شبد یاد آ رہے ہیں۔

"انسان اکیلا ہی اپنا دوست ہے
انسان اکیلا ہی اپنا دشمن ہے"

اسی طرح دھماپد میں لکھا ہے۔ انسان ہی اپنا آقا ہے اور انسان ہی اپنا مقصد ہے جب بھی مجھے اس کی یاد آتی ہے اس کے اس مضمون کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے جو اس نے ہندوازم کے بارے میں لکھا تھا ۸ صفحے کے اس مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"زندگی برج کے کھیل کی طرح ہے ہم کھیل ایجاد نہیں کرتے یا پتے ڈیزائن نہیں کرتے۔ ہم قوانین مرتب نہیں کرتے اور نہ ہی کھیل کی حالت پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ پتے خود ہمیں دیئے جاتے ہیں — اچھے یا برے۔ لیکن ہم اچھا کھیل بھی کھیل سکتے ہیں اور برا بھی —"۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بہت ہی اچھا کھیل پیش کیا

رامن راگھاؤ۔ اسے پھانسی دو!

جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کی وجوہ تلاش کرتے ہیں۔ جب ایک شخص بہت سے لوگوں کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کے دماغ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رامن راگھاؤ، چھبیس مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس وقت وہ دو دشمنوں کو قتل کرنے کے الزام میں ملوث ہے۔ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ جج نے اس کے وکیل کا یہ استدلال برطرف کر دیا ہے، کہ رامن فاترالعقل ہے۔ "میں پاگل نہیں ہوں ——" رامن کہتا ہے —— "تم سب پاگل ہو ——"

رامن نے یہ راستہ کیوں اپنایا —— اپنے اعتراف کی بنا پر وہ اس وقت کا بہت بڑا قاتل کیوں بنا؟ میں نے یہ سب اس کے اعترافی بیانات اور اس کے ڈاکٹر کی رائے سے اخذ کیا، جس نے اس کا علاج کیا تھا۔

رامن کا تعلق تامل ناڈو کے گاؤں سے ہے۔ اس کے خاندان کے چھ افراد ہیں۔ ماں کے لئے اس کے دل میں بہت کم پیار ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے، کہ اسے اپنے باپ سے بہت پیار تھا۔ اس پیار کی توجیہ وہ عجیب طریقے سے کرتا ہے۔ "میرا باپ مجھے چوری اور قتل کرنا سکھاتا تھا۔ وہ خود بھی ایسا کرتا تھا۔ اور کئی دفعہ ان جرائم کی پاداش میں جیل گیا تھا ——"، رامن بتاتا ہے۔ پدری اثر فیصلہ کن تھا۔ "چوری بڑا عمدہ پیشہ ہے"، میں بچپن سے یہی کرتا آیا ہوں۔ اس نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ دو سال میں مرشن کتابیں۔

رامن کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ اس کے تین بہن بھائی (جن کو وہ بہت محبت کرتا تھا) بھی مر چکے ہیں، صرف ایک بہن پاربتی زندہ ہے۔

عورتوں سے نفرت رامن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی ان سے نفرت۔ معاملہ کچھ سمجھ میں آنے والا نہیں۔ اس کے پہلے تجربے سے کچھ راز سے آگاہی ہوتی ہے۔ تامل ناڈو کی رسوم کے مطابق اس کی شادی اس کی بہن کی بیٹی سے طے پائی، جس کا نام گروایا تھا۔ شب عروسی سے پہلے ہی اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس دوران گروایا کو حمل ٹھہرا اور ایک مردہ بچے کو جنم دے کر وہ دنیا سے سدھار گئی۔ یہ بیوفائی اور دھوکہ ایک مرتبہ پھر ہوا۔ گاؤں کے بزرگوں نے اس کے لئے ایک لڑکی اور تلاش کی۔ رامن کو معلوم ہوا کہ یہ عورت پہلے ہی کسی مرد کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھی، اور اس کے بچے بھی ہیں۔ اسے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ شادی کے بغیر بھی جو چاہے، حاصل کر سکتا ہے۔

بورسٹل جیل میں جس لڑکے سے رامن کی دوستی ہو گئی، اس نے اسے بمبئی بلا لیا۔ یہاں اسے پہلی مرتبہ جنسِ مخالف کا تجربہ ہوا۔ دونوں دوست ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔ رامن دن کی شفٹ میں، اور اس کا دوست رات کی شفٹ میں۔ ایک رات جب بارش زوروں پر تھی، اس کے دوست کی بیوی نے رامن کو اپنے بستر میں بلایا۔ رامن نے انکار کیا۔ اگلے روز عورت نے اپنے خاوند سے شکایت کی، کہ گذشتہ رات رامن اس کی عزت پر حملہ آور ہوا تھا، لیکن وہ بچ گئی۔ رامن کو اس گھر سے نکال دیا گیا۔

اس طرح رامن کو دھوکہ دیا گیا۔ اس کی بے عزتی ہوئی۔ اور اس کو گالیاں دی گئیں۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا، کہ ہر بدبختی کے پس منظر میں عورت ضرور موجود ہے۔ وہ عورت سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گیا، اور لٹیرا بن گیا۔ اگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا، تو وہ بھی کسی کو کچھ نہ کہتا۔ لیکن وہ بدمعاش بن گیا۔ وہ آخر آوارہ گردی میں گرفتار ہوا اور پولیس کے تشدد کا نشانہ بنا۔

دھوکہ دہی، ڈاکہ زنی، چوری اور تشدد کے کئی مقدمات کے تحت اس نے کئی بار جیل یاترا کی۔ ایک دو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد وہ ثبوت نہ ملنے کی بنا پر وہ چھوٹ بھی گیا۔ دو دفعہ اسے ذہنی مریض کی حیثیت سے ذہنی امراض کے اداروں میں بھی بھیجا گیا، مگر ہر دفعہ نارمل رپورٹ ملی۔ وہ بمبئی میں اپنے شب و روز کے بارے کہتا ہے:

"میں اکثر اوقات طوائفوں کے پاس جاتا تھا۔ میں مختلف عورتوں کے ساتھ شب بسری کرتا رہا۔ میں چوری کرتا رہا، تاکہ زیادہ روپیہ حاصل کر سکوں۔"

"جنسی خواہش انسان کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے ۔۔۔ ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔" وہ ڈاکٹر کو فلسفیانہ انداز میں بتاتا۔ "جس طرح کار کو پیٹرول کی ضرورت ہے، اسی طرح مرد کو جنسی تسکین کی۔"

اس طرح جنس اور جرم رامن کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا، کہ رامن اپنی جنسی بھوک کہاں مٹاتا تھا۔ شاید شہر کے ریڈ لائیٹ ایریا میں۔ لیکن چوری یا ڈاکہ زنی کے لئے وہ مضافات کے دور دراز علاقوں میں جاتا۔ خاص طور پر اُن لوگوں کے ہاں، جو سیلاب یا سیم کی وجہ سے نقل مکانی کر کے ایک دوسرے سے فاصلے پر رہنا شروع کر دیتے تھے، وہاں وہ رات کی خاموشی میں زنا کرتا، لوٹتا اور قتل کر دیتا۔ اس نے علاقے میں دہشت پھیلا دی۔ لوگ شام ہوتے ہی گھروں میں قید ہو جاتے۔ وہ ان کو اُن کے گھروں میں آدبوچتا۔ اکثر اوقات راہگیر صرف دس نئے پیسوں کے لئے قتل ہو جاتے، مگر ہر واردات بڑی پلاننگ سے ہوتی، اور تفصیلات ظاہر کرتیں، کہ یہ کسی ایک ہی فرد کی کارروائی ہے۔ پہلے پہل وہ کند آلات استعمال کرتا۔ بعد ازاں اس نے لوہے کے نوکدار ٹکڑوں کو استعمال کرنا شروع کیا، جسے وہ اپنے شکار کے کانوں کے پاس گھونپتا۔ جن لوگوں نے تاریکی میں اسے فرار ہوتے دیکھا، وہ کہتے ہیں، کہ اس نے داڑھی اور سر کے بال بڑھا رکھے ہیں، اور سادھوؤں کی طرح ترشول ہاتھ میں اُٹھا رکھی

ہے۔ کچھ کہتے، کہ قاتل گنّے کا بھیس بدل لینے پر قادر ہے، یا بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اس کے اعترافات سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا، کہ یہ رامن راگھاؤ کا کام ہے۔ قتل کی ہر واردات ہر کسی کا خون منجمد کر دیتی۔

ایک چائے فروش، جس نے رامن کو گندی چائے پیش کی، بڑی مشکل سے اپنی کھوپڑی بچا سکا۔ دوسرے اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ ایک واردات کا اعتراف کرتے ہوئے رامن کہتا ہے ۔۔۔ "میں نے ایک باریش مسلمان کو اپنی کھاٹ پر سوئے ہوئے دیکھا۔ صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے لوہے کی مضبوط سلاخ اس کے سر پر دے ماری۔ داڑھی والا وہیں مر گیا۔ اس واردات میں مجھے دو سو باسٹھ روپے حاصل ہوئے۔ لیکن چند روز بعد کی واردات میں اسے صرف دس نئے پیسے اور تھوڑا سا گھی میسر آ سکا۔ چند روز بعد پھر رامن نے ایک خاندان پر حملہ کیا۔ کچھ دنوں تک وہ ان کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ اس نے بتایا، کہ اس کوٹھڑی میں ایک کھاٹ پر ایک مرد، عورت اور بچہ لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میں پچھلی دیوار سے اُوپر چڑھا، اور دیکھا، کہ عورت بچہ کو پاؤڈر والا دُودھ پلا رہی ہے۔ میں نے سونے کی ایک زنجیر عورت کے گلے میں دیکھی۔ تین بجے تک عورت کو نیند نہ آئی۔ میں تین چار روز اس کوٹھڑی میں جاتا رہا، ہر دفعہ عورت بیدار نظر آئی۔ پانچویں روز وہ سوئی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے قبضے کاٹ کر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔ دو چارپائیوں کے درمیان خالی جگہ پر کھڑے ہو کر میں نے مرد پر دو تین بار لوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی، وہ مر گیا۔ عورت چلانے لگی۔ بچہ صرف دو ماہ کا تھا۔ دو تین ضربوں سے بچہ بھی ختم ہو گیا۔ پھر میں نے عورت کو بھی ختم کر دیا۔ میرا خیال تھا، کہ میں عورت کے ساتھ سوؤں گا بھی۔ میں نے عورت کے گلے سے زنجیر نکال لی۔ اس کی گردن کے گرد کالا دھاگہ بھی تھا۔ میں نے وہ بھی کھول لیا۔ زنجیر اپنی جیب میں ڈالی۔ مجھے جو عورت کے

ساتھ سونے کا خیال آیا عورت کے بستر کے قریب مٹی کے تیل کا لیمپ تھا۔ میں نے روشنی گل کر دی۔ لیکن اسی وقت کسی نے بتی جلائی اُدھر۔ ایک عورت بھاگتی ہوئی اُدھر سے نیچے آئی۔ اس کی عمر ستر برس کے قریب ہو گی۔ جب اس نے خون دیکھا، تو چلانے لگی، میں بھاگ نکلا۔

خون کی یہ ہولی راتوں میں کھیلی جاتی رہی۔ لوگ یا تو لوہے کے وزنی سریوں سے مرتے رہے، یا ان کی پیشانیاں چیر دی جاتیں رہیں، لیکن قاتل ہر بار کسی نہ کسی طریقے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کا سب سے زیادہ بہیمانہ قتل کچھ یوں ہے:

آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں ایک عورت اور دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ بچوں کی عمریں آٹھ نو سال کی تھیں۔ عورت درمیان میں سو رہی تھی۔ میں نے تین چار ضربیں عورت کو لگائیں، وہ مر گئی۔ عورت نے اپنے آپ کو صرف ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ تقریباً عریاں ہی تھی۔ میں اُس مردہ عورت کے ساتھ سویا۔ اور میں نے اس کی چھاتیاں بھی چوسیں، جن سے دودھ نکل رہا تھا۔

"کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟" ڈاکٹر نے رامن سے پوچھا۔

"جب میں چھوٹا تھا، تو خدا کو مانتا تھا، لیکن اب نہیں، میں مندر نہیں جاتا۔"

"کیوں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ خدا عورت کی جانبداری کرتا ہے۔" رامن نے جواب دیا۔

رامن کی یہ جنس زدہ نفرت اس کے جنسی استعارے کی واضح دلیل ہے۔ جب جیل کے نائی نے اس کی مونچھیں صاف کر دیں، تو وہ غیض و غضب میں آ گیا، اور نائی کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔ سات دن تک اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ "یہ تو ایسے ہی ہے، جیسے کسی کا سر کاٹ دو۔ میں عورتوں اور زنخوں کی طرح نظر نہیں آنا چاہتا۔" اس نے ڈاکٹر کو وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اگر میں تمہارے بچے کو ماروں، تو

تمہیں تکلیف نہ ہو گی؟ بالکل اسی طرح مجھے اپنی مونچھیں صاف کرنے کی تکلیف ہوئی ہے۔"

رامن کو عورتوں کی خواہش ہے۔ اُس نے انتظامیہ کو پیشکش کی۔ "مجھ کو ایک سال کے لئے ضمانت پر رہا کر دیں۔ میں چوری یا قتل نہیں کروں گا۔ میں ایک سال کسی عورت کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، بیوی کی حیثیت سے نہیں، سالمق کی حیثیت سے۔ عورت کی عمر تیس سال سے کم ہونی چاہیئے۔ اور اگر بچہ پیدا ہو گیا، تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ میرے بچہ کو پالے۔ مجھے طوائف بھی قبول ہے۔ میں اس سے ہمبستری کرنا چاہتا ہوں، روٹیاں پکوانا نہیں چاہتا۔"

رامن کے بقول اُسے مارا پیٹا گیا، اور اعتراف کروانے کے لئے گانجا بھی پلایا گیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ لیکن پھر اس کے اندر کی آواز نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔ "میں نے جبر کے زیرِ اثر اعتراف نہیں کیا، بلکہ میرے دل نے آواز دی، کہ اعتراف کر لو۔"

رامن راگھاؤ سیاہ رنگت کا مضبوط بدن کا شخص ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بال، سفید قمیص اور کالی پتلون میں ملبوس (پولیس کمشنر نادکارنی نے مجھے بتایا، کہ رامن اپنی پتلون تکیئے کے نیچے رکھ کر استری کرتا ہے۔)

اس کے ماتھے پر ہر وقت تیوری ہوتی ہے۔ اور ایسے معلوم ہوتا ہے، گویا وہ دنیا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی عبادت گزار کی طرح ٹہلتا ہے۔ جب جج کمرہ عدالت میں آتا ہے، تو وہ تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے۔ اور جو کرسی اُسے پہنائی گئی ہے، اس کے درمیانی سرے کو اس طرح پکڑے رہتا ہے، جیسے کوئی بادشاہ عصا کو۔ وہ عدالتی کاروائی بڑے انہماک سے دیکھتا ہے۔ وکیلوں کی آمد و رفت، سننے والوں کے چہرے۔ گویا کوئی بادشاہ اپنے دربار کا ملاحظہ کر رہا ہو۔ اور لوگوں کی آنکھیں ہمیشہ اس پر مرکوز رہتی ہیں۔ جب وہ باہر نکلتے ہیں،

تو اس کی طرف دیکھا کرنے کی جرات نہیں رکھتے۔ صرف ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکی نے مسکرا کر رامن کی طرف دیکھا، تو رامن کے چہرے پر ایک حریصانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی، تو رامن نے اعتراف کر لیا۔ جج نے پوچھا: "تم مزید کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں،" رامن نے جواب دیا۔ "حکومت نے مجھے سرکاری وکیل تو مہیا کر دیا ہے، لیکن نہانے کے لئے صابن اور سونے کے لئے سورت نہیں دی۔"

رامن کے اپنے ہی ضابطے ہیں۔ یہ اس کا قانون ہے۔ آفیسر کے سامنے سگریٹ نہیں پینا چاہیئے۔ آفیسر کو اپنی ڈیوٹی کے دوران تمباکو نوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ اُس نے تشخیص کے دوران ڈاکٹر کی پیش کردہ سگریٹ واپس کر دی۔ اور اس دوران جب ڈاکٹر نے سگریٹ سلگائی، تو رامن نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بیرے پر جی بھر کر غصہ نکالا، جس نے پینے کے پانی کے ٹب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس نے ایک بچی کو بُری طرح ڈانٹ پلائی، جس نے گندہ رومال رامن کو واپس کر دیا تھا۔

وہ تحریر کردہ الفاظ کی عزت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ جج سے ایک ہی بات پوچھتا، کہ پہلے بیان میں کیا لکھا گیا ہے۔ وہ کہتا، ٹھیک ہے، میں نے اعتراف کر لیا ہے، لیکن ریکارڈ درست رکھنا چاہیئے۔ وہ اپنا نام، پتے، اور پرانے جو پولیس واردات سے پکڑ کر لائی، چیک کرتا۔

اس نے اپنے استعمال شدہ ہتھیاروں کی بھی شناخت کی۔ قرض کے متعلق بھی اس کے اپنے ہی اصول ہیں۔ "میں نے ہمیشہ ادائیگی کی، اور کبھی اُدھار نہیں کھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ادائیگی کہاں سے ہوئی۔ میرے پاس رقم نہیں تھی، اس لئے میں نے

قتل کیا، اور رقم حاصل کی۔"

رامن راگھاڈ میں ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے، جسے خوف کا کوئی احساس نہیں۔ "ہم ناڈو، مرنے سے خوف نہیں کھاتے۔" وہ فخر سے کہتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے بھی آگاہ ہے، جو اس سے خوفزدہ ہیں۔ اس نے بڑی رغبت سے عدالت میں اپنے ایک ہتھیار کی پہچان کرائی، حالانکہ اس وقت لوگوں کے سانس رُکے ہوئے تھے۔

"ڈرو نہیں،" وہ لوگوں سے کہتا۔

میں نے صرف ایک دفعہ اس کے چہرے پر خوف کی ایک موہوم سی لکیر دیکھی، وہ بھی چند ثانیوں کے لئے۔ اُسے ایک ایک تصویر دکھائی گئی، جس میں درلاشیں تھیں، انہیں کے قتل پر اس پر مقدمہ چلا تھا۔

"کیا تم انہیں پہچانتے ہو، جنہیں تم نے قتل کیا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

رامن راگھاڈ کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی لکیر اُبھری۔ پھر اس نے فوراً اُن پر سے نظر ہٹائی، اور کہا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میری نظر کمزور ہے۔"

ستیہ جیت رے

کیمرہ میں پہلی بار کسی فلم کے شاٹس لے رہا تھا۔ آرٹ ڈائریکٹر کا یہ دوسرا تجربہ تھا۔ سیٹ میں شامل اداکاروں کی اکثریت پہلی مرتبہ کیمرے کے سامنے آئی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہدایت کار باقی ممبروں کی طرح خام تھا۔ اس فلم کی تکمیل میں تین سال صرف ہوئے۔ شوٹنگ بھی صرف ویک اینڈ پر ہی ہوا کرتی تھی، جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت حاصل کرتے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے کام کئی کئی ماہ تعطل کا شکار رہا۔ لیکن نتیجے کے طور پر جو کچھ پردۂ ظہور پر آیا، نقادوں نے اسے فلمی دنیا کا شاہکار مانا۔

پتھر پنچالی نے ستیہ جیت رے کو فلمی دنیا کا سب سے بڑا ڈائریکٹر بنا دیا۔ اس نے بھارتی سینما کو ایک سچا شاعر عطا کیا۔ اپراجیتو اور آپور سنسار فلمی دنیا میں خوبصورت شاعری کا خوبصورت نمونہ تھیں۔ شاید ڈان سکوئی کے میکسم گورکی سرالمیہ سے بھی زیادہ اعلیٰ۔ ایک درجن سے زائد فیچر فلموں اور کئی چھوٹی فلموں کے بعد ستیہ جیت رے بھارتی فلم انڈسٹری کی پہچان بن چکا تھا۔ خاص طور سے غیر ملکی ناظرین کے لئے۔ درحقیقت ایک ایک نقاد کی اس رائے میں کوئی شبہ نہیں، کہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد اگر ثقافت کے میدان میں کسی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے، تو وہ ستیہ جیت رے ہے۔

ستیہ جیت کی فلموں نے بین الاقوامی سطح پر بار بار ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔

کینز، وینس، برلن اور سان فرانسسکو کے فلمی میلوں نے ستیہ جیت رے کی اس غیر معمولی ذہانت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن گذشتہ ہفتے تو اسے ایک بہت قیمتی ایوارڈ "میگا سے سے" سے نوازا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ پہلی دفعہ کسی فلم ڈائریکٹر کو نصیب ہوا ہے۔ اُسے فلمی دنیا کا شاعر مانتے ہوئے، اس کی فلموں کو مثبت اقدار کا حامل تصور کیا گیا ہے۔ اس کے ہیرو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اپنے معاصر فلم سازوں مثلاً فرانس کے ترو فاٹ، سپین کا بونل، سویڈن کا انگمر برگ مین، اٹلی کا فیلینی اور جاپان کا اکیرا کیوروسوا سے فلم سازی میں بہت آگے تھا۔ اس نے ڈائریکٹر اور فلم بینوں کے درمیان تعلق پیدا کیا۔ سینما صرف تفریح کا سامان ہی مہیا نہیں کرتا، بلکہ تخلیقی فن کا ذریعہ بھی ہے۔ جس طرح کہ کوئی ناول یا مصوری کا نمونہ۔ ترو فاٹ کی "فیو لمز ایٹ فم" اور رینائس کی "ہیروشیما مون آمار" میں کرداروں کی بجائے پلاٹ زیادہ طاقتور تھا۔ اور یہی پلاٹ ہدایت کار کا کسی بھی چیز کے بارے ذاتی نقطۂ نظر ظاہر کرتا ہے، اور فلم بینوں کو متاثر کرتا ہے۔

رے نے بھی یہی مقصد سامنے رکھا ہے۔ لیکن اس کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ شانتی نکیتن میں مصوری کے اُستاد نند پال بوس کی بات یاد کرتا ہے "درخت کی تصویر ضرور بناؤ۔ لیکن مغربی انداز میں نہیں۔ اُوپر سے نیچے کی طرف نہیں، درخت اُوپر کی طرف بڑھتا ہے، نہ کہ نیچے کی طرف"۔ رے کا کہنا ہے، کہ اس کی تمام زندگی اور مستقبل کے لئے یہ سیدھی راہنمائی تھی۔

وہ فلموں میں اپنے ذاتی نظریات کو جگہ دیتا ہے، اور اس کی خواہش ہے، کہ اس کا پیغام اس کی ہر فلم میں شامل ہو کر عوام تک پہنچے۔

کیا رے کا [illegible] نظریہ زندگی ہے؟ دوسرے عظیم ہدایت کاروں کی طرح وہ بھی طے شدہ اصولوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہر فلم میں اس کا نظریہ زیادہ واضح

اور مناسب سمت والا نظر آتا ہے۔ اپنی پہلی فلموں میں وہ بھارتی بلکہ بنگالی مرد پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن بعد کی فلموں (جس میں چارولتا زیادہ مشہور ہے) میں عورت اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ وہ اخلاقی فیصلے کو ٹھونسنے کے خلاف ہے — "دیوی" میں وہ توہمات کے خلاف "ترقی پسند" طاقتوں کے ساتھ اتحاد میں شامل نہیں ہوتا جبکہ "مہاپُرش" میں وہ مذہب کو نرمی سے رگیدتا ہے۔ "جلسہ گھر" میں ایک مرتے ہوئے زمیندار سے اس کی پوشیدہ ہمدردی نظر آتی ہے۔ وہ مجسم تناقض ہے۔ "کنچن جنگا" میں طبقۂ اُمراء کے خلاف اس کی نفرت واضح ہے، لیکن "تین کانیا" کی کہانیوں میں وہ ایک شخص کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے، جو سیالکوٹی جرابیں پہنتا ہے، آکسفورڈ کے جوتے استعمال کرتا ہے۔ نپولین کی تعریف میں رطب اللسان ہے، بلکہ واعظ خود بین ہے۔

ستیہ جیت رے پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ تشدد، جنگ اور سماجی اصلاحات کے سلسلے میں وہ ناکام ہوا ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسی کوشش کی بھی، تو وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ ہیرو کی سی دلیری کی بجائے ایک نرم خو انسان کی کوششوں پر یقین رکھتا ہے۔ پینی لوپ ہوسٹن کا کہنا ہے، کہ رے کے ہیرو، شاعر، ایسے ادیب جن کو پبلشر میسر نہ آئیں۔ دائمی طالب علم، خواب دیکھنے والے، جو سوسائٹی میں مذاق کا نشانہ بنائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کرکٹ کی باتیں کرتے ہیں، اور بہبہ کی دوڑ میں شامل ہیں۔ اپنے تضادات اور مجموعات کے لحاظ سے رے مکمل طور پر ایک بھارتی ہے۔ حقیقت پسندی، انسانیت، شاعری اور ہندوستانیت اس کی فلموں کی اصل رُوح ہیں۔

لیکن ستم کی بات ہے، کہ شک و شبہ سے بالاتر غیر معمولی ذہانت کے باوجود ستیہ جیت بھارتی فلم بینوں کے لئے اجنبی ہے۔ بلکہ نجولی پر سرکاری حلقوں میں بہت

تنقید کی گئی، کیونکہ ان کے مطابق اس میں بھارت کا جو تصور پیش کیا گیا تھا، وہ مناسب نہیں تھا۔ جلسہ گھر کی تیاری کے دوران اُسے برقی قوس نہ مل سکے، جن کی اُسے شدید ضرورت تھی۔ رے خود افسوس سے اس بات کا اظہار کرتا ہے، کہ جو عزت اُسے ملک سے باہر حاصل ہے، وہ اپنے ملک میں نہیں۔ کیا اس سے وہ بددل ہو گیا ہے — نہیں! ہرگز نہیں — وہ کہتا ہے — "ذرائع کا محدود ہونا ہماری ہنرمندی کے راستے میں رکاوٹ ہے، اور ایسے ہی نا مساعد حالات میں شاہکار تخلیق ہو سکتے ہیں — میں جس جگہ ہوں، اور جو کام کر رہا ہوں، اس سے بے حد مطمئن ہوں —"

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جو اس کا اظہار کر سکتے ہیں؟

بلراج ساہنی

میں نے کئی جگہ یہ بات تحریر کی ہے، اور محسوس بھی کی ہے، کہ مرد اپنی بیٹی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میرے دوست بلراج ساہنی کو بھی چند ماہ پہلے اپنی بیٹی شبنم کی موت کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ اس نے اس صدمے کو بظاہر بے جگری سے برداشت کیا، مگر ٹیس بہرحال دل میں موجود رہی۔

شبنم ایک نہایت ہی خوبصورت بچی تھی۔ زندگی اور مسکراہٹ سے بھرپور۔ حتیٰ کہ اُس کی عجیب حرکتوں میں بھی ایک دلچسپ خوبی موجود تھی۔ اس کی شادی ہوئی، لیکن یہ شادی بربادی ثابت ہوئی، اور شبنم کی زندگی سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ بلراج بھی مسکرانا بھول گیا۔ آخری بار جب میری اُن سے ملاقات ہوئی، تو وہ جوہو والے گھر میں تھے۔ میں نے جب شبنم کو یاد دلایا، کہ اس کی زندہ دلی کے قصے تو پنجاب بھر میں مشہور تھے، تو اس نے صرف معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلادیا۔ جب کبھی ہم بلراج کے گھر جاتے، تو شبنم ہمیں کھانا اور بیئر سرو کرتی۔ بلراج کی تعریفی نگاہیں اپنی بیٹی کی حرکات و سکنات کا احاطہ کرتیں۔

میں بلراج کو گزشتہ چالیس سال سے جانتا ہوں۔ میں کسی اور ایسے دوست کو نہیں جانتا، جس نے اتنی محبت دی، اور عوض میں کچھ بھی طلب نہ کیا۔ میں نے کئی بار اُس سے تیز و تند گفتگو کی، لیکن اُسے کبھی غصہ نہ آیا، نہ ہی جواباً اس نے کوئی فضول گفتگو کی۔ اس کی محبت نہ صرف دوستوں کے لئے بے انتہا تھی، بلکہ دشمنوں کے لئے بھی وہ

اسی احساس کا مالک تھا۔ وہ سکول ٹیچر کی حیثیت سے اس محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بمل رائے کی دو بیگھہ زمین میں اس نے رکشہ کھینچنے والے کا بھرپور کردار کر کے اس محبت کا اظہار کیا۔

میں نے بلراج کے مارکسی ہونے کو کبھی سنجیدگی سے نہ دیکھا۔ وہ تو غریب کا ساتھی اور اچھے کام کرنے والے کا معترف تھا۔ "داس کیپیٹل" اس نے اسی جذبے کے تحت مطالعہ کی تھی۔ اس نے ترقی پسند نمائندوں کی انتخابی مہم میں حصّہ لے کر اور قحط زدہ افراد کی مدد کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

کم لوگ جانتے ہیں، کہ بلراج مارکس، اینگلز یا لینن کی نسبت گرنتھ صاحب کا زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے مطالعے کے کمرے میں گرنتھ صاحب کا بڑے سائز کا نسخہ ہمیشہ کھلا پڑا نظر آتا تھا۔ اور اس نے اس کے اقتباسات زبانی یاد کر رکھے تھے۔ اپنی مستقل مزاجی کی مدد سے اس نے پنجابی لکھنا سیکھا، اور اپنے مضامین گورمکھی رسم الخط میں ٹائپ کیئے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے پنجابی رسالے "رنجیت" کے لئے وہ کالم لکھا کرتا تھا، اور اس کے کالم بے حد عمدہ تھے۔

بلراج کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اس کی زندگی کے تضادات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ یوم مئی (مزدوروں کا عالمی دن) کو پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی موت تیرہ اپریل کو خالصہ سکھ ازم کی سالگرہ کے دن ہوئی۔ اس کی آخری خواہش تھی، کہ اس کی موت پر مذہبی رسومات نہ کی جائیں، لینن کی تعلیمات اور سُرخ جھنڈا اس کے پہلو میں رکھا جائے۔

کیا وہ کمیونسٹ تھا یا سکھ ــــ ؟

بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی

ستیہ سائی بابا سے اس کی مشابہت حیران کن ہے۔ سر پر ویسے ہی بکھیوں کے چھتے جیسے بال، آپ ہی کی طرح چمکدار آنکھیں۔ وہی نرم مسکراہٹ اور وہی زعفران رنگ کا چغہ — وہ بھی ویسے ہی معجزے کرتا ہے۔ فضا میں ہاتھ لہراتا ہے اور اس کی ہتھیلی پر وبھتی (مقدس راکھ) ہوتی ہے۔ اس کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ وہ بیماروں کو تندرست کر دیتا ہے۔ ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ معجزوں کا یہ مالک ۶۰ برس کا بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی ہے جسے اس کے پیروکار مالک، راہنما، گرو اور خدا کا اوتار کہتے ہیں۔

اخبار میں اس کی آمد کے اشتہار بھی میری نظروں سے گذرے ہیں ورشن کے خواہشمند امیر لوگوں کی رہائشی علاقے میں جاتے ہیں۔ نیل کنٹھ کا ایک پارسی پیروکار جہانگیر مجھے وہاں لے گیا۔

طویل ہال عبادت گذاروں اور ان کی نظروں سے بھرا تھا سب خوش لباس تھے اور اپر مڈل کلاس سے ان کا تعلق تھا ایک ڈائس پر ایک خالی کرسی رکھی تھی جس پر ریشمی غلاف تھا۔ اس کے پاس ہی دوسری کرسی پر بابا کی رنگین تصویر رکھی تھی اس کے فریم کے گرد ایک ہار تھا اور درجنوں اگربتیاں اس تصویر پر معطر دھواں پھینک رہی تھیں۔

بابا آئے — سب لوگوں نے تعظیم کی۔ بعض نے ان کے پاؤں چھوئے — وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے اور عبادت گذاروں کے ساتھ مل کر گانے گئے اوم نمو (؟) دوم نامو نارائن۔ لکشمی، گنا پتی اور دیگر تمام دیویوں کی عبادت کی جا رہی تھی۔

رہا۔ دھرما نمسکار۔ انہوں نے ایک چاندی کے لیمپ کی مدد سے آرتی اتاری گانے اور تالیوں کی آواز عروج پر پہنچ گئی اور اچانک ختم ہو گئی نیل کنٹھ جی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ہم چھ لوگ ان کے خاص کمرے میں بلائے گئے۔ ہم فرش پر ان کے پاؤں کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ گفتگو کی ان کو ہندی زبان پر عبور نہیں تھا اس لیے اپنے ایک چیلے سے اکثر تیلگی زبان کا ہندی مترادف پوچھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک غریب کسان کے پانچ بیٹوں میں سے ایک ہیں۔ جب ان میں ورثہ تقسیم ہوا۔ تو ان کے حصے تھوڑی سی جو۔ آئی اور بیمار باپ بھی ان ہی کے حصے میں آیا۔

وہ کس طاقت کے زیر اثر ہیں — وہ خود نہیں جانتے لیکن لوگوں کے ذہن میں عجیب عجیب باتیں ہیں جب انہوں نے ایک بیمار شخص کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس کا بخار غائب ہو گیا جب انہوں نے ایک شخص کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا جو گینگرین کی وجہ سے اسے کٹوانے ہسپتال جا رہا تھا تو اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ ایک چیلہ جو میرے پیچھے بیٹھا تھا بتانے لگا کہ وہ دوبارہ زندہ ہوا ہے بابا نے مجھے دوسری زندگی عطا کی ہے کیا تم ان کے گرد روشنی کا ہالہ نہیں دیکھ سکتے — کیا میں نے بابا کے گرد روشنی کا ہالہ دیکھا — ؟

انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں آگے سرکا۔ انہوں اپنی ہتھیلی پر انگوٹھا رگڑا اور میرے سر پر تھوڑی سی راکھ گرائی انہوں نے دوبارہ ایسا ہی کیا تو ایک براؤن رنگ کی رس بھری ان کے ہاتھ پر آ گری — اسے اپنے گلے میں ڈالو۔ انہوں نے کہا۔ انہوں نے اپنی تصویر والا سٹیکر مجھے اپنی جیب پر لگانے کو دیا! ایک تصویر کار پر لگانے کو دی اور ایک انگوٹھی انگلی میں پہننے کو دی جس پر ان کی تصویر کندہ تھی۔ یہ کچھ پھل ان کے لیے لائے تھے انہوں نے سب کے سامنے تقسیم کر دیئے لیکن یہ صرف آپ کے لیے ہیں — ایک

خاتون نے مزاحمت کی ۔ "میں جس چیز کو ہاتھ لگا دیتا ہوں وہ پرساد بن جاتی ہے"۔ انہوں نے کہا اور عورت کو ایک سیب اور کیلا دے دیا ۔ انہوں نے آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں ہمیں اپنے آشرم آدم نگر میں آنے کی دعوت دی جہاں لنگے دمبران کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس نے ہمیں دعائیں دیں اور ہم نے رخصت لی

شری نیل کنٹھ کے اندر ایک غیر قوت ہے جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے سکون کا باعث ہیں اور جو لوگ پیر نابل ہونے میں یقین رکھتے ہیں ان کے لیے تو بابا کی ذات معجزوں سے بھری ہوئی ہے

ساتھی برت ـــ عورت باز

آپ ایسے ادیب کے بارے میں کیا اندازہ لگائیں گے جس نے اپنی کتاب میں انجلا انیتا این باربرا، بریڈا، کیرولین، کوئی سنتھیا، ڈمی بورا، ڈورین، آئی لین، الزبتھ، ایمی، فاطمہ، گیسل جینی، ہیلن، گرین، آئرس، جین، جینٹ، جوڈی، کاتھی، کرسٹینا، لارا، لیونا، لینڈا، لورنا رُتن، مارگریٹ، میری، مے، موریا، نتالیا، نینسی، پینی لوپ، فیلس، راشنا، رونا، رونڈا، سیلی سانتا، سوزن، تانیا، اُرسلا، ویلا، وینڈی اور سے نام کی ممنون ہوں

"ایک عورت باز ہندوستانی کے اعترافات" ـــ اس کتاب کا کیا ٹائٹل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے نعام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک معروف ہندوستانی نقاد تو اسے پہلے ہی "فحش" قرار دے چکے ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ ہندوستانی اس میں اپنا آئینہ دیکھ سکتے ہیں۔ جنسی ہیڈلیری کے واقعات کے باوجود اس کتاب میں ایک بات ضرور موجود ہے اور وہ ہے "اعتراف"

بہت کم ہندوستانیوں نے اپنی تخلیقات انگریزی زبان میں پیش کی ہیں لیکن انہوں نے اتنی اچھی زبان پیش نہیں کی۔ لیکن ۳۲ سالہ ساتھی برت نے اعلیٰ برطانوی ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے اور نقادوں کی توجہ حاصل کر لی ہے۔

وہ عورت باز نظر نہیں آتا مختصر سا قد اور سر کے بال گنج کی طرف مائل مختصر سی داڑھی کے پیچھے کمزور سی ٹھوڑی۔ غیظ و غضب کی حالت میں وہ خوبصورت لگتا ہے۔ انگریزی بنگالی لہجے میں بولتا ہے تو مزاج کا معلوم ہوتا ہے۔ جب میلکم میگرج نے کہا تھا کہ اصل انگریز تو ہندوستان ہی میں رہ گئے ہیں تو یقیناً اس نے بنگالیوں کو بھی شمار کیا تھا۔

میری اور برت کی بات چیت بنگالیوں اور انگریزوں کی نفرت و محبت کے موضوع سے شروع ہوئی۔ بنگالی ہمیشہ انگریزوں کی طرح ادب تخلیق کرتے ہیں ہندوستانی

ثقافتی روایات سے بالکل قطع نظر، لیکن دوسری طرف انتہاپسندی ہے۔ بنگالی ہندوستانی روایات پر پہرہ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان روایات کا محافظ سمجھتے ہیں۔ یورپ میں اگر کوئی قوم بنگالیوں کی طرح سوچتی ہے تو وہ انگریز ہے۔ وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز ہیں لیکن انگریزوں کی روایات سے انتہائی متنفر بھی۔ میں نے پوچھا، "سفید چمڑی کے بارے احساس برتری رکھنے والے ہندوستانیوں کی کیا یہ خواہش نہیں ہوئی کہ کسی سفید لڑکی پر فتح یاب ہوں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ ایک بنگالی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جس رات وہ انگریز عورت کے ساتھ سویا تھا اس نے محسوس کیا کہ "تاج برطانیہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔"

"کیا ہمیں بھارت میں جنسی انقلاب کی ضرورت نہیں۔ خاص طور سے درمیانی طبقے کیلئے"

"جنسی انقلاب مسئلے کا حل نہیں، کیونکہ یہ تو فوری طور پر آ سکتا ہے۔ بنیادی طور پر جس تبدیلی کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ بزرگ نسل کی احمقانہ باتوں کی اطاعت سے گریز۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بزرگ نسل واقعی احمق ہے اور نوجوان نسل ہوشیار ہیں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک پچپن سالہ بوڑھے کو اس کی حقیقی عقل کے مطابق درجہ دینا چاہیئے اور یہ ہرگز فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ اپنے سے چند برس کی عمر سے وہ واقعی عقل مند ہے بزرگی کی یہ ہیبت مکمل طور پر ختم ہونی چاہیئے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا جنسی انقلاب ناممکن ہے۔"

"کیا دونوں طرف ایسا نہیں۔ بھارت کی نوجوان نسل نے بذات خود بوڑھوں کی یہ حکومت قبول کر رکھی ہے ـــ"

"ہاں ـــ میں نے اپنی پہلی کتاب میں اپنے ایک ایسے چچا زاد کی مثال دی ہے جسے ایک کم ذات لڑکی سے محبت کرنے کی بنا پر بری طرح پیٹا گیا تھا اور پھر اس نے کمال صحافت سے مجھے بتایا کہ اس کے باپ نے اسے ٹھیک ہی مارا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو اسی کا مفاد عزیز تھا تو اس طرح یہ کنبہ ذکار روئی تو نہ ہوئی"

"آپ بھارت کی نوجوان نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے ـــ"

اپنے ماں باپ کی سرپرستی سے جتنا جلد نکل سکیں نکلیں۔ اس کا نتیجہ بداعتدالی کی صورت میں تو ضرور نکلے گا لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے بالآخر مثبت نتائج حاصل ہوں گے بس مربیانہ اور سرپرستانہ انداز سے باہر نکلیں معاشی طور پر سماجی طور پر جذباتی طور پر ـــ"

"کیا آپ نے ایسا ہی کیا تھا اور اسی لیے بھارت سے باہر چلے گئے تھے ـــ"

"مجھے کالج کی ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو کسی اور کی بیوی بن چکی تھی میرے اندر بغاوت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا اور یہی میرے لیے آخری سہارا تھا۔"

"اس فیصلہ کن علیحدگی میں کیا واقعات ہوئے ـــ"

"میں ایک دقیانوسی برہمن گھرانے میں جوان ہوا۔ اس کی تمام تر پابندیوں کے ساتھ انیس سالہ نوجوان ہونے کے باوجود مجھے اپنی ماں کو بتانا ہوتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور رات ساڑھے نو بجے تک واپسی بھی لازمی ہوتی تھی۔ اگر کسی لڑکی کا فون آ جاتا تھا۔ تو تمام کی تمام فیملی افراتفری کا شکار ہو جاتی تھی اگر سگریٹ پیتے دیکھ لیا جاتا تو سمجھو دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے برٹش کونسل میں ایک دعوت میں بلایا گیا۔ ڈبل اور چیزوں کے علاوہ سکاچ بھی تھی۔ پینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اپنے کے پوچھے جیسے جتنی وہسکی جو سوڈے سے بھری تھی میں نے ایک ایک سپ کر کے تین گھنٹوں میں ختم کی اور پھر مجھے پان کھانا پڑا اور چیونگم کھانی پڑی تاکہ گھر والوں کو اس کی بدبو نہ آ سکے۔ میرے نام لکھے گئے خط کھول لیے جاتے تھے یہ کام پوشیدہ نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی کو احساس تھا کہ وہ غیر معمولی کام کر رہے ہیں۔ ان تمام تکلیف دہ باتوں سے میرے اندر ایک ماحول پیدا ہوتا گیا۔ نہ صرف ان سے بلکہ سڑک پر چلتے ہوئے بزرگوں کی فرمائی ہوئی بہت سی یہ کرو وہ نہ کرو قسم کی باتوں نے مجھے باغی بنا دیا ـــ"

"آپ کا خیال ہے کہ بھارت میں ان پابندیوں اور ایسے ماحول کی وجہ سے تخلیقی کام کی حوصلہ افزائی ناممکن ہے اور یہی ملک چھوڑنے کی ایک وجہ تھی کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ اسی وجہ سے بہت سے بھارتی ادیب بھارت میں رہتے ہوئے انگریزی میں لکھ سکتے۔" "میرا خیال ہے کہ یہ ممکن تو ہے لیکن وہ وہ انگریزی نہیں ہوں ـــ"

تو ادیب تنہا ادیب ہے تو وہ بلا شرکت غیرے ایک اور زبان تخلیق کر سکتا ہے لیکن ایک باریک سی تمیز ضرور رکھنی پڑے گی۔ اس کی تحریر میں اس معاشرے کی جھلک ضرور ملے گی جس میں وہ رہ رہا ہے۔ زبان کی اہمیت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ الفاظ کے مطالب کا فرق معاشرے میں آنے والی تبدیلی سے واضح ہوتا ہے۔"

"کیا خیال ہے مغرب میں تخلیق ہونے والا ادب فی زمانہ صرف الفاظ کی شعبدہ بازی اور محاوروں کی جادوگری نہیں ——— اور کیا اصل مسائل اور حقیقی تخلیقی تحریک ابھی تک بھارت ہی میں ہیں ———؟"

"یقیناً ——— ایک ناول نگار کے لیے یہ بہت زرخیز جگہ ہے۔ متنوع معاشرہ، ثقافتوں کا تصادم، مذاہب کا تفرقہ یقیناً یکساں دوڑنے والے معاشرے سے زیادہ انگیخت کا حامل ہے۔ برطانیہ میں ایمپائر ختم ہونے اور طبقات کے جزوی طور پر ختم ہونے سے زندگی خاصی بے نمک ہو چکی ہے۔ ایسی بے نمک سوسائٹی کے اپنے فائدے اور نقصان ہیں۔ خاموشی، سکون، سست روی، جزوی طور پر با اخلاق اور کام کرنے کے لیے بہترین ماحول ——— یہ ہیں ایسے معاشرے کے فوائد اور نقصانات ہیں مردہ پن اور سنجیدگی اور اس طرح لوگ شہرت حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ اور کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ میرے خیال کے مطابق مسائل کا حل یہ ہے کہ بھارت میں نہ صرف زندگی گزاری جائے بلکہ اسے دریافت کیا جائے یہ تمام مواد اکٹھا کر کے انگلینڈ جانا چاہیے اور وہاں بیٹھ کر لکھنا چاہیے ———"

"کیا چار سو روپے یومیہ والے ہوٹل میں رہ کر آپ کو احساس جرم نہیں ہوتا ———؟"

"نہیں ہرگز نہیں ——— میں نے انتہائی گھناؤنے اور غلیظ علاقوں میں زندگی گزاری ہے ——— میں اتنی غربت بسر کر چکا ہوں کہ میں ہر وقت اچھی رہائش اور اچھے ماحول کا متلاشی تھا اور میں اس میں کوئی احساس جرم محسوس نہیں ہوتا جب دوسرے لوگوں کی خوشامد کرتے ہوئے یا پھر بمبئی کے چار فٹ ضرب چار فٹ کے کمرے میں رہتے ہوئے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے جیسا کہ میں کرتا تھا [illegible] مزدوری ہیں ہفتے میں، تو پتہ چلتا ہے کہ غربت ایک جرم ہے امارت کوئی جرم نہیں ———"

"لیکن کیا اخلاقی طور پر برا نہیں لگتا کیونکہ بہت سے لوگ تو دو وقت کا کھانا حاصل نہیں کر سکتے ———؟"

"بکواس ——— غربت میں کوئی رومان نہیں ——— غریب بھی اتنے ہی ذلیل ہیں جتنے کہ امیر ——— اور اس کے اظہار کے لیے ان کے پاس زیادہ ظالمانہ ہتھیار ہیں ———"

"آپ کی دونوں کتابوں اور آپ سے گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے برطانیہ جانے کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہاں جنسی طور پر آزادانہ ماحول ہے ———؟"

"ہاں ——— میرا بھی یہی خیال ہے ——— مرد اور عورت کے درمیان عقل و دانش کا تبادلہ جس میں جذبات، جنسیات اور شہوانیت شامل ہوں، بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کسی کو یہ تجربہ حاصل نہیں ہوا تو اس نے ایک معذور کی طرح زندگی گزاری ہے۔"

"کیا آپ اس بات کے حامی ہیں کہ شادی سے پہلے نوجوانوں کو اکٹھے رہنا چاہیے بشرطیکہ وہ اس عمل کو جرم نہ سمجھیں ———؟"

"بالکل ——— ہر حالت میں ——— خواہ وہ احساس جرم ہی رکھیں ——— آپ کسی دوسرے کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں ——— صبح کے وقت بدبودار سانس، رات کو بستر پیشاب سے معطر ہو جاتا ہے ——— میرا مطلب ہے کہ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہیں بھارتی خود غرضی تبدیل کرنا پڑیں گے۔ لیکن تبدیل کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے اصل نکتہ تو یہ ہے کہ زندگی تجربے کا نام ہونا چاہیے تاکہ قبولیت کا ———"

"شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ——— کیا اسے ایک کلچر کے طور پر اپنانا چاہیے ——— ایک دائمی بندھن ———؟"

"ہرگز نہیں ——— میں اس خیال کا حامی نہیں کہ ایک مرد و عورت کو [illegible]"

"اور بچوں کا کیا ہوگا — وہ کہاں فٹ ہوتے ہیں —؟"

"ہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔ میرے پاس فی الحال اس کا کوئی حل نہیں اصل میں بچے ہی ہیں جنہیں اس سارے بکھیڑے میں تکلیف ہوگی۔ دراصل ہم ایسی کشتی میں آ بیٹھے ہیں جہاں سے ہمیں ابھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے آخر کار کرنا کیا ہے —"

اصل میں شادی کا ارادہ اس وقت معرض وجود میں آیا جب انسان کی اوسط عمر تیس سال تھی یعنی ایک جوڑا شادی کے تقریباً دس سال میں اکٹھے گذار پاتا تھا اور پھر باقی رہ جانے والا کسی اور کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ میرا خیال ہے یہ قدرتی حل تھا جنسی تنوع کا —!

"یہ بالکل درست ہے۔ بہت سے لوگ آج بھی اس طرح کے معاہدے کر لیتے ہیں ہر پارٹنر اپنی جنسی سرگرمیوں میں آزاد ہوتا ہے۔ لیکن یہ جذباتی صدمے کا باعث ہو سکتا ہے کسی مرد کے لیے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کی بیوی آج کسی اور کے ساتھ سو رہی ہے۔"

"کیا آزادی نسواں کی تحریک کا جزوی عنصر بھی یہی ہے —؟"

"یقیناً ہے — کیونکہ ہمیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ ایک مرد اگر ساتھ ہزار عورتوں کے ساتھ سو سکتا ہے تو یہ اس کی مردانہ قوت یا مردانگی کی نشانی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر عورت ایسا کرے تو اسے فاحشہ کہا جاتا ہے —"

"اور پھر سماج کی کچھ رسوم و قیود بھی تو ہیں —"

تو اور کیا — فرض کریں کہ میں اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ سونے کی اجازت دیتا ہوں تو معاشرہ مجھے کیا کہے گا۔ احمق، بیوقوف گاڈو — یہ ہیں سماجی جمود میں نہیں رہتے آپ پر پیچیدہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جلد ہی آپ اپنی بیوی سے کہیں گے: دیکھو — تم اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ جب میں لوگ مجھے احمق اور گاڈو سمجھیں — اور وہ جواب دے گی: لیکن جب تم دوسری لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو تو پھر وہ کیا کہتے ہیں — اوہ — اس کی فکر نہیں — کیونکہ میں ایک مرد ہوں — یہ آپ کا جواب ہوتا ہے اور آپ وہیں پہنچ — ہے جہاں سے آپ نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہے — ایک سو پچاس روپے کی خریدی ہوئی وائٹ ہارس کے

آخری گھونٹ پی رہے تھے۔ — یہ وہی مکار آسٹریلوی آرٹسٹ ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ وہ یہاں پر شراب پینے کے بہانے آنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی میں دلچسپی لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے۔

بالا صاحب ٹھیکری

ایس۔ ایس۔ چیف

بالا صاحب ٹھیکری (شیو سینا کا لیڈر) ایک امریکی رسالے نے اُسے فسطائی بیان کیا ہے۔ وہ خود یہ کہتا ہے، کہ ایک ہی کتاب ہے، جو میں نے پڑھی ہے، وہ ہٹلر کی کتاب مین کیمف ہے۔ مجھے اپنے خیالات کو دوسرے قسم کے لٹریچروں میں ملانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں نے بہت سے جلسے جلوسوں کو سُنا ہے، جو بالا صاحب کی شیو سینا نے کیے۔ اور جس نے بمبئی کی زندگی کو ساکت کر دیا، اور جنوبی ہندوستان کے رہنے والوں کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا۔ دو ہفتے قبل جب میں ایئر انڈیا کی ایک پرواز سے سانتا کروز کے ایئر پورٹ کی طرف سفر کر رہا تھا تو اس کو دو جگہ رُکنا پڑا، تاکہ پرچم بردار سینا کے ہجوم کو شیواجی پارک جانے کا راستہ مل سکے۔ اگلے روز حکومت کے ان احکامات کے باوجود کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے۔ اور اس یقین دہانی کے باوجود کہ دکانوں اور دفتر جانے والوں کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ سیکڑوں درجنوں کی تعداد میں جمع ہوئے، اور اُنہوں نے بمبئی میں ایسی ہڑتال کرائی، کہ جس سے بارہ گھنٹے ہر کاروبار مفلوج ہو کر رہ گیا۔ صرف وہی دکانیں کھلی رہیں، جن کی اُنہوں نے اجازت دی۔ صرف وہی گاڑیاں چلیں، جس کی اُنہوں نے ضرورت سمجھی۔ اور صرف اُن اداروں میں کام ہوا، جہاں کام کرنے کی اُنہوں نے اجازت دی۔ اُس دن بمبئی میں وزیر اعلیٰ وی۔ پی۔ نائیک کی حکومت نہ تھی، بلکہ شیو سینا کے چیف بالا صاحب ٹھیکری کی حکومت تھی

میں نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے یہ سوچ کر خود پر ملامت کی، کہ کوئی آخر ایک نامعلوم صحافی کے ساتھ مل کر کھانے کی زحمت نہیں کرے گا۔

کیا ہٹلر، مسولینی یا سٹالن کسی عام ادیب جیسے ہینس، جیراتی یا الیوان کو جواب دینا پسند کریں گے؟ اسی خوف کی بنا پر ٹھیکری صاحب سے خود جا کر ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالا صاحب سانتا کروز کی شاہراہ کے قریب ایک خوبصورت جدید طرز کی کالونی کے ایک چھوٹے سے ولا میں رہائش پذیر ہیں۔ مجھے کوئی گارڈ نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سامنے والا گیٹ بھی بند نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا سا کتا جو کہ گریٹ ڈینز نسل کا تھا، ہم پر بھونکنے لگا۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گریٹ ڈینز نسل کے کتے بہت اچھے دوست ہوتے ہیں۔ مگر وہ اتنے بیوقوف ہوتے ہیں، جتنے وہ بڑے ہوتے ہیں۔ بہتر تھا، کہ وہ السیشن نسل کا کتا رکھتا، جس کی خوراک کم ہوتی ہے، مگر خونخوار زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں پر چیف بذاتِ خود ہمارے سامنے موجود تھا۔ ایک عام قسم کا انسان جس نے پیتل کے بنے ہوئے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سفید پاجامہ اور قمیض پہن رکھی تھی، اور کندھے پر شال ڈال رکھی تھی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ خود اُس کے ہاتھ مجھے بڑے ملائم اور نرم محسوس ہوئے۔ "چیتا ایک شیر کو سلام کرتا ہے" اُس نے مجھ سے کہا۔ چیتا شیو سینا کا نشان تھا۔

میں نے جواب دیا "میں بہت ہی غریب سکھ شیر کی مثال ہوں"

وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا، جو کہ صوفے، بازوؤں والی کرسیوں ٹیلیفون اور ریڈیو سیٹ سے سجا ہوا تھا۔ میں نے وہاں شیواجی کی تصویریں دیواروں پر آویزاں دیکھیں۔

گرم جوشی سے آؤ بھگت کرنے پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اسی اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جب بات ختم کر کے اس نے ریسیور رکھا، تو میں نے اپنی بات دہرائی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا جواب دے سکے، ٹیلیفون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار جلد ہی اُس نے فون بند کیا، اور یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا، "یہاں ہماری بات چیت نہیں ہو سکتی، اوپر چلتے ہیں۔ آپ اپنے جوتے اتار لیں، کیونکہ دوسرے کمرے میں ہمارے دیوتا ہیں۔" میں نے ایسا ہی کیا، جیسا اس نے کہا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے سے گزرا، تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک سن رسیدہ جوڑے اور شیواجی کی کئی تصویریں دیوار پر لگی ہیں۔ میں اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا۔ اُس نے مچھروں کی شکایت کرتے ہوئے درمیانے درجے کا پنکھا چلایا، اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ صوفے کے دوسری طرف شیواجی کی قدِ آدم تصویر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے مرہٹہ ہیرو کی تین اور تصویریں گنیں۔ میرا میزبان جب دیوتا کے بارے میں کچھ کہتا، تو اس کی مراد شیواجی ہوتی تھی (ایسا اس نے متعدد بار کہا) وہ شیواجی کے پورے القاب چھترپتی شیواجی مہاراج کا استعمال کرتا۔ جب وہ یہ کہتا، تو اس کی آواز میں آہنگی آجاتی۔ جس سے اس کے ادب کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

بال ٹھیکری ایک شریف اور شگفتہ مزاج آدمی ہے۔ انہیں ایک عقلمند آدمی سمجھا جاتا ہے۔ میں بھی اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں۔

وہ ایک بہت اچھا کارٹونسٹ ہے۔ اور اس کی آواز بڑی پُر کشش ہے۔ اور ان تمام خامیتوں کا امتزاج بہت پُر اثر ہے۔ میں یقین کر سکتا ہوں، کہ وہ سننے والے کو ضرور باندھ کر رکھ دیتا ہو گا۔ عام طور پر وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کا زیادہ حصّہ مہاراشٹر کے رہنے والوں کے ساتھ ہونے والی بے انصافی ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا زیادہ تر نشانہ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے بنتے ہیں۔ بال ٹھیکری

کوئی اعلیٰ درجے کا سیاستدان نہیں ہے۔ اسے بے بس کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔

شیو سینا کے پاس مہاراشٹر میں رہنے والے غیر مقامی لوگوں کو دینے کے لیے کیا ہے۔ وہ کچھ مسالوں اور سکھوں اور مسلمانوں اور سکھوں کا نام لیتے ہیں۔ شیو سینا باقی ہندوستان کو کیا دے سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے وہ یہ دیتا ہے، کہ مجھے پنجاب، یوپی اور مدھیہ پردیش سے کئی دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔

میں نے اس سے اس الزامات کے بارے میں پوچھا، جو دہلی سے شائع ہونے والے بائیں بازو کے ایک رسالے میں اُن کے خلاف فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کے لیے لگائے گئے تھے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا، اور کہا، میں فرقہ پرستی کا نمبر ایک دشمن ہوں۔

وہ اُن مسلمانوں پر سخت تنقید کرتے ہیں، جو دوہری وفاداری رکھتے ہیں۔ اور اسرائیل کے خلاف ہونے والے ہنگاموں اور اُن سیاستدانوں، جن کی وجہ سے الاقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، پر تنقید کرنے پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

میں نے اس سے 'مین کیمف' کے بارے میں سوال کیا:

اُس نے غصّے سے جواب دیا، "ہاں، میں نے اسے پڑھا ہے۔" لیکن امریکی صحافی نے میرے ہٹلر جیسے ہونے کا جھوٹ بولا ہے۔ انہیں تجربات کی بناء پر میں صحافیوں سے کم ملتا ہوں۔

انگریزی پریس تو خاص طور پر میرے خلاف ہے۔ وہ جان بوجھ کر شیو سینا کی طاقت کو کم بیان کرتے ہیں، اور ہماری تحریک کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اُس نے مجھے بیئر پیش کی۔

وہ مجھے اپنے والد سے ملانے لے گیا۔ پچاسی سالہ پربودھنکر ٹھیکری چارپائی پر چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ اُن کا کمرہ بھی گھر کے دوسرے کمروں کی طرح شیواجی کی تصاویر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا شیواجی کا مجسمہ ایک کونے میں پڑا تھا۔

میں الوداع ہونے لگا، اس نے پھر میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اور پھر اُسی طرح

گریٹ ڈینز نسل کے کتے نے مجھے بھونک کر الوداع کیا۔

کیا وجہ تھی، کہ یہ انسان دوست شریف آدمی اس قدر انقلابی اور تلخ بن گیا۔ کیا بچپن کا کوئی تجربہ؟ یا والدین کی شفقت سے محرومی یا کوئی اور واقعہ، یہ سب کچھ معلوم کرنا ایک وقت میں بہت مشکل ہے۔ ہاں کچھ حقائق مجھے ضرور معلوم ہوئے ہیں، کہ وہ پونا میں پیدا ہوا، اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے۔ ایک ذہین کارٹونسٹ ہے۔ وہ فری پریس جرنل میں کام کر چکا ہے۔ کارٹونسٹ لکشمن، الوا سراہم اور رای۔ نرائن، جو کہ لنک کا ایڈیٹر ہے، اُس کے ساتھیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ اُس نے اپنا اخبار مارو ک نکالا۔ اس اخبار میں اُنہوں نے بمبئی کے رہنے والوں کی تکالیف اور مشکلات کو سامنے لائے۔ اس طرح وہ وہاں کے محروم لوگوں اور طبقوں کا روح رواں بن گیا۔ مارمک نے ہی شیو سینا کو جنم دیا۔

کیا بالا صاحب ٹھاکرے جمہوریت کے لئے کوئی خطرہ ہے؟ میں سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ ان کی تحریک کا بمبئی سے باہر پھیلنے کا بہت کم امکان ہے۔ مہاراشٹر میں رہائش پذیر غیر مقامی لوگ مہاراشٹر کے مقامی لوگوں کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتے۔ باقی ہندوستان کے لئے شیو سینا کے پاس کچھ نہیں، جیسا کہ طاقتور اکر۔ ایس۔ ایس کے پاس۔ اس کے علاوہ بالا صاحب نے مجھے قائل کر لیا، کہ وہ افسر نہیں ہیں۔ وہ ایک سیاسی رہنما ہے، یا شاید ایک قومی لیڈر۔ جس کا امکان کم ہے۔

دانیال وال کاٹ ــ فضائی سمگلر

میرا اور اس کا سامنا ایک ڈنر پارٹی میں ہوا۔ میں ٹھیک طرح سے یہ نہ پوچھ سکا، کہ وہ دانیال وال کاٹ ہے، جو کہ ایک مشہور سمگلر ہے۔ مگر اس نے اس بات کو یہ کہہ کر خود ہی آسان بنا دیا، کہ تم السٹریٹڈ ویکلی کے ایڈیٹر ہو؟ یہ ہی میری پسندیدہ مطالعہ کی چیز ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، اور کہا، کہ آپ تو صحافیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہاں میں کرتا ہوں، اور تلخی سے مسکرا کر بولا، وہ ایسے لوگوں کا گروہ ہے..... جو کچھ وہ میرے بارے میں لکھتے ہیں، اسے پڑھ کر مجھے یقین نہیں آتا، کہ یہ سب کچھ میرے بارے میں ہے۔

وہ ہندوستان کی ہر چیز کے بارے میں تلخ رویہ رکھتا ہے۔ میں نے اسے جایا، کہ وہ بہت سے لوگوں کے دل جیت چکا ہے۔ وہ لاپرواہی سے گزرتے ہوئے دہلی میں اپنے دوستوں کو چاکلیٹ اور سگریٹ بانٹتا ہوا پاکستان کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ میں یہاں سے اس لئے گزرتا ہوں، کہ یہ راستے میں پڑتا ہے، لیکن، یہاں سے کوئی تحفہ کسی کے لئے نہیں لایا۔

اس نے مجھے انڈین ایئر فورس کے ساتھ ایک مقابلے کے بارے میں بتایا، جو اُسے روکنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہاں ہنٹر طیاروں کا گروہ تھا۔ اُنہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا، جبکہ میں پاکستان سے کافی دُور تھا۔ ایک طیارے نے مجھے واپس مڑ جانے کا حکم دیا، اور ڈرایا، کہ وہ مار گرائے گا۔ میں جانتا تھا، کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کسی بھی جنگی جہاز کو مسلح کرتے ہوئے ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ اور کوئی جیٹ طیارہ زیادہ دیر تک نیچی پرواز نہیں کر سکتا۔

میں کافی نیچے آگیا، اور تعاقب کرنے والوں کو اپنی تکمیل کرنے کو کہا۔ اس وقت پاکستانیوں نے ہماری گفتگو سن لی، اور وہ میری مدد کرنے کے لئے آگئے۔ میرا کراچی میں شاندار استقبال کیا گیا۔ بھٹو نے ٹیلیفون پر مجھے مبارکباد دی۔

وہ ہندوستان میں اپنے اوپر ہونے والے دوبارہ حملے کے بارے میں زیادہ بات کرنے کا خواہاں نہیں تھا۔ مگر وہ اس پر اصرار کرتا رہا، کہ اُس نے کوئی چیز سمگل نہیں کی، اور یہ سب من گھڑت ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاست کے بارے میں حیرت انگیز طور پر بہت کچھ جانتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پاکستان کی جانب ہیں۔

وال کاٹ واپس پیرس چلا جاتا ہے۔ جہاں اپنے دوست کو دی ہوئی کار حاصل کرتا ہے، اور پھر لندن میں اپنے کاروبار کو منظم کرتا ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ ایئر ویز کمپنی قائم کرنے کا، ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے پاس کافی دولت ہے۔

ایک بہت ہی خوشگوار اتفاق ڈنر پارٹی میں ہوا۔ مسٹر فلپ ٹالبوٹ، جو کہ صدر کینیڈی کے مشیروں میں سے تھے، اور بعد میں سفیر بھی رہے۔ شہر میں آئے۔ میں نے انہیں پارٹی میں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ انہوں نے وال کاٹ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا تھا، لیکن انہوں نے ہماری باتیں سن لیں۔ اور وہ ہمارے پاس آگئے۔ اور دانیال سے رسمی ڈپلومیٹک لہجے میں پوچھا، مسٹر وال کاٹ، کیا آپ ہندوستانی حکومت کے ساتھ ہیں؟ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا، ہاں، میں اس حکومت کا چھ سال مہمان رہا ہوں۔

ٹالبوٹ اس دو معنی بات کو نہ سمجھ سکے، اور کہا، بہت خوب۔ میرا خیال ہے، آپ نے اپنا قیام خوشگوار گزارا ہوگا۔

ہماری زیرِ طبع مطبوعات

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کے اداریوں کالموں اور خطوط کا مجموعہ

قلم زار

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار بلونت گارگی کی سوانح عمری

ننگی دُھوپ

ہندوستان کی افسانہ نویس اجیت کور کی سوانح عمری

خانہ بدوش

ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار دلیپ کور ٹوانہ کی سوانح عمری

ننگے پاؤں کا سفر

سنہ ۱۹۴۷ء کے واقعات پر مبنی رامانند ساگر کی عظیم کتاب

اور انسان مر گیا

مکتبۂ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور ۲۵